معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۰ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۷ء عدد ۳

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

ادبیات

شذرات

ان صفحات میں متعدد بار اس کا تذکرہ آیا ہے کہ بعض خود غرض ناشرین دار المصنفین کی اجازت کے بغیر اس کی مطبوعات چھاپ رہے ہیں۔ ہم کو زیادہ شکایت پاکستان کے ناشروں سے تھی لیکن ہندوستان اس معاملے میں پیچھے نہیں ہے، چوری ہمیشہ ہی ہوتی تھی لیکن یہ بہت پست اور معمولی لوگ کرتے تھے اور وہ بھی رات کے سناٹے میں، یا سنسان جنگلوں اور بیابانوں میں ڈاکو راہ گیروں کو لوٹ لیتے تھے، مگر حکومتیں ان کی روک تھام کی پوری کوشش کرتی تھیں اور جو لوگ پکڑ میں آتے تھے انہیں سخت سزا ملتی۔ لیکن اب اونچے طبقوں کے لوگ بھی یہ کام کر رہے ہیں اور شاید ہی کبھی ماخوذ ہوتے ہوں، انہوں نے چوری کے ایسے ایسے طریقے اور صورتیں ایجاد کر لی ہیں جن کی وجہ سے ہر شخص کے لیے یہ آسان ہوگئی ہے اور ہر قدم پر اس کی گنجایش بھی پیدا ہوگئی ہے ؎

شہریست پر زخوباں وز ہر طرف نگارے یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

ہم جس طرح کے لوگوں سے دوچار ہیں وہ ناشروں اور تاجرانِ کتب کا گروہ ہے یہ بڑی ڈھٹائی سے دار المصنفین کی کتابیں چھاپ کر اس کے لیے مصیبتیں اور مشکلات پیدا کر رہے ہیں، ان میں دہلی اور دیوبند کے بعض ناشرین بھی ہیں جو تقدس کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں، پتہ نہیں ان کے نزدیک یہ چوری، ڈاکہ زنی اور اکل اموال بالباطل ہے بھی یا نہیں، فقہی تاویلوں اور حیلوں سے تو ہر چیز جائز کر لی جاسکتی ہے۔

سردست یہ گفتگو میں ختم کر کے ہم دار المصنفین کے خیر خواہوں اور قدر دانوں کو یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ اس کی اشاعتی سرگرمیاں اس وقت تیز اور بہتر ہوگئی ہیں، الحمد للہ ایک نئی کتاب "تذکرۃ الفقہاء" حصہ اول چھپ کر تیار ہوگئی ہے، جس کے مرتب مولوی عمیر الصدیق رفیق دار المصنفین ہیں، ایک اور نئی کتاب "اسلام و مستشرقین" حصہ ششم کی کتابت ہوچکی ہے اور جلد ہی انشاء اللہ طباعت شروع ہوگی اس وقت ملک میں آزادی کی گولڈن جبلی منائی جارہی ہے لیکن یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ مسلمان رہنماؤں کا نام نہیں لیا جاتا، مولانا ابو الکلام آزاد جیسے جنگ آزادی کے ممتاز رہنما بھی فراموش کیے

جارہے ہیں، مولانا دار المصنفین کے بڑے محسن اور علامہ شبلی کے احباب خاص میں تھے، ان کے اس گہرے تعلق کی بنا پر اس موقع پر ان سے متعلق ایک کتاب شایع کرنے کا ارادہ ہے جس کی کمپوزنگ شروع ہوگئی ہے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے اسکالر جمشید ندوی صاحب مضامینِ معارف کا اشاریہ تیار کر رہے ہیں جو تکمیل کے مرحلے میں ہے۔

دار المصنفین کی پرانی مطبوعات کی طباعت کا کام بھی ہو رہا ہے، اسی مہینے میں تذکرۃ المحدثین حصہ دوم کا دوسرا ایڈیشن نکلا ہے، مختصر تاریخ ہند کورس کی کتاب ہے حال ہی میں اس کا ایک اچھا ایڈیشن چھپا ہے اس سے پہلے گجراتی بادشاہی شایع ہوئی تھی، اسلام و مستشرقین حصہ اول اور تاریخ دولت عثمانیہ عرصے سے ختم تھیں انکے نئے ایڈیشن بھی نکلے ہیں، سیرۃ النبی حصہ سوم اور سیرۃ النعمان کی کمپوزنگ ہورہی ہے۔ کمپوزنگ یا کتابت کیلئے جو کتابیں دی جاتی ہیں انہیں بغور پڑھ کر غلطیوں کی تصحیح، چھوٹ جانے والے یا نامکمل حوالوں کی تخریج کے بعد ہی دیا جاتا ہے، پروف اور کاپیوں کی دیدہ ریزی سے تصحیح کی جاتی ہے اور سیرت وغیرہ کے اشاریے اور انڈکس بھی تیار کیے جارہے ہیں، اسکی اور بجلی کے وقت بے وقت اور مسلسل آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں تک غائب رہنے کی وجہ سے اشاعتی مہم میں تاخیر ہورہی ہے، اس وقت ارض القرآن، تاریخ اسلام، تاریخ فقہ اسلامی اور انقلاب الامم کی مراجعت کا کام ہو رہا ہے اور تذکرۃ الفقہاء اور تذکرۂ مفسرین ہند کے دوسرے حصوں اور تذکرۃ المحدثین حصہ چہارم کی تالیف و ترتیب کا کام بھی جاری ہے۔

متحدہ ہندوستان میں اس وقت کے ممتاز قومی لیڈروں میں مولانا ابو الکلام آزاد ہی وہ شخص تھے جو آخر آخر تک ملک کی تقسیم پر راضی نہیں ہوئے تھے مگر یہاں ایک خاص ذہن اور طرز فکر کے لوگ مولانا کو بالکل ہی فراموش کر دینا چاہتے ہیں، اسکے برعکس پاکستان میں جس کے وجود میں آنے سے قبل تک وہ اسکے شدید مخالف رہے مگر وجود میں آنے کے بعد وہ ہمیشہ اس کی ترقی و استحکام کے آرزومند رہے انکے دو بڑے عقیدتمند اور عظمت شناس مولانا غلام رسول مہر اور شورش کاشمیری برابر ان کی شرح و ترجمانی کرتے رہے اور اب انکی خالی مسند ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے سنبھال لی ہے اور اس وقت وہ مولانا کے سب سے بڑے محقق اور ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کے یہ پاکستانی محقق و ترجمان ان پر کتب کثیرہ شایع کر چکے ہیں لیکن وہ اس پر مطمئن نہیں ہیں نئی کتابوں کی ترتیب و تسوید کے ساتھ ہی مولانا سے متعلق پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن اضافہ و تحشیہ کے ساتھ شایع کرنا ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہوگیا ہے، پاکستان و ہندوستان کی آزادی کے پچاس سالہ جشن کی مناسبت سے انہوں نے سات کتابیں شایع کی ہیں، ابھی ہم کو پانچ کتابیں ملی ہیں جن میں یہ تین مولانا پر ہیں، انڈیا ونس فریڈم۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور انکے چند بزرگ دوست اور عقیدتمند۔ کلیات آزاد، دو اور کتابوں کا تعلق بھی تحریک آزادی کے دو قائدین سے ہے، مکاتیب مولانا عبید اللہ سندھی اور مناقب شیخ الاسلام (مدنی) موخر الذکر کے علاوہ چاروں کتابیں ان ہی نے مرتب کی ہیں۔ انڈیا ونس فریڈم (اردو ترجمہ پروفیسر مجیب) میں فاضل مرتب کے محققانہ حواشی نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس میں وہ ۳۰ صفحے بھی شامل ہیں جو ۳۰ برس کے لیے محفوظ کیے گئے تھے اور کئی اہم ضمیموں کے اضافے بھی ہیں۔ یہ علمی خدمت بجائے خود نہایت لایقِ تحسین ہے لیکن یہ کتابیں دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات کی استواری کے جس جذبہ سے شایع کی گئی ہیں وہ بھی بڑا قابل قدر ہے۔ انکا پتہ ہے: ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پاکستان، کراچی۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے صدر پرنس انجم قدر کی وفات ملک و ملت کا بڑا حادثہ ہے، سنیوں سے بھی ان کے روابط تھے، وہ دونوں فرقوں میں اتحاد و مفاہمت کے بڑے حامی تھے اور مشترکہ ملی مسائل کے حل کے لیے سنیوں کے ساتھ ہر جد و جہد میں شریک رہتے تھے، مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت اور بابری مسجد تحریک سے ان کا گہرا تعلق تھا، دوسرا حادثہ میجر علی حماد عباسی کی اچانک وفات ہے، وہ شبلی کالج میں انگریزی کے استاد اور آخر میں پرنسپل ہوئے، پڑھنے لکھنے کا اچھا ذوق تھا اور مشرقی و مغربی ادب پر خاصی نظر تھی، وقتاً فوقتاً طنزیہ و مزاحیہ اور ادبی و تنقیدی مضامین لکھتے تھے جن کے بعض مجموعے چھپ گئے ہیں، طالب علمی کے زمانے ہی سے دارالمصنفین برابر آتے تھے جس کا سلسلہ آخر تک قائم رہا۔ پروفیسر محب الحسن کی کتاب کشمیر انڈر سلاطانز کا اردو ترجمہ "کشمیر سلاطین کے عہد میں" کے نام سے کیا جو دارالمصنفین سے شایع ہوا۔

مقالات

دنیائے نباتات میں خدائی نظارے

از
مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ بنگلور

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتر یست معرفتِ کردگار

شیخ سعدیؒ کا یہ شعر حقایق کی ایک دنیا اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو عالم نباتات سے تعلق رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے نباتاتی مظاہر کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی۔ امام غزالیؒ نے جدید سائنس کی ترقی سے صدیوں پہلے کہہ دیا تھا کہ حیوانات و نباتات میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ حیوانات "چلتے پھرتے پودے ہیں" جب کہ نباتات زمین میں "گڑے ہوئے حیوانات" ہیں جو منھ کے بل دھنسے ہوئے ہیں۔ باقی سارے کام دونوں میں یکساں طور پر انجام پا رہے ہیں۔ چنانچہ نباتات بھی حیوانات ہی کی طرح غذا کے محتاج ہیں۔ لہذا وہ اپنی جڑیں زمین کے اندر گاڑ کر پانی اور غذا چوستے ہیں: جو ڈالیوں سے ہوتی ہوئی پتیوں تک پہونچتی ہے۔ اس اعتبار سے نباتات کی جڑوں کی مثال ان کے منھ جیسی ہے۔ جس طرح کہ حیوانات اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ چوستے ہیں بالکل اسی طرح نباتات بھی زمین سے اپنی غذا چوستے ہیں۔ (خلاصہ از الحکمۃ فی مخلوقات اللہ)

جدید سائنس کی تصدیق

چنانچہ جدید سائنس نے تصدیق کر دی ہے کہ پانی اور دیگر نمکیات (جیسے کیلشیم، سوڈیم، پوٹاشیم، فاسفورس اور لوہا وغیرہ)، جو پانی کے اندر گھلے رہتے ہیں

جڑوں اور ڈالیوں سے ہوتے ہوئے پتیوں تک جا پہنچتے ہیں اور پتیاں پانی اور زمینی نمکیات کی مدد سے مواد نشاستہ یعنی کاربوہائیڈریٹ تیار کرتی ہیں جو غذا اور پھلوں کا غالب جزو ہوتا ہے۔ نیز جدید تحقیقات کی رو سے ثابت ہو چکا ہے کہ نباتات بھی حیوانات ہی کی طرح سانس لیتے ہیں، احساس وادراک رکھتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور "شادی بیاہ" کرکے بچے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے بچے وہ بیج یا پھل ہوتے ہیں جو انجام کار ان سے برآمد ہوتے ہیں اور پھر یہی بیج دوبارہ نشوونما پا کر اپنی ہی جیسی نسل کو وجود میں لاتے ہیں اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

ایک عام آدمی روزانہ پیڑ پودوں سے حاصل کی ہوئی غذا کھاتا ہے، انواع واقسام کی ترکاریاں اور قسم ہا قسم کے پھل استعمال کرتا ہے، مگر وہ کبھی غور نہیں کرتا کہ یہ ساری چیزیں کارخانۂ قدرت میں کس حیرت انگیز طریقے سے وجود میں آرہی ہیں اور ان کو ظہور میں لانے کے لیے زمین اور آسمان کی تمام قوتوں کو مل کر کس طرح کام کرنا پڑتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نباتاتی دنیا کے مطالعہ سے اتنے سارے حقائق واسرار سامنے آتے ہیں جو انسان کی فکر ونظر کو صیقل کرنے اور اسے درس عبرت دینے والے ہیں۔ حیوانی اور انسانی زندگی کا سارا دارومدار نباتات پر ہے اور حیوانات ونباتات کے باہمی تبادلے سے باعث فضا میں آکسیجن اور زمین میں نائٹروجن کا تناسب قائم ہے۔ اگر اس تناسب میں ذرا سا بھی بگاڑ آجائے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اور انسانی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

اللہ ہر چیز کا خالق ونگران

اللہ تعالیٰ اس کارگاہ عالم کا رب اور کارساز ہے۔ لہٰذا اس نے اس عالم رنگ وبو کی ہر چیز حد درجہ حکمت اور منصوبہ بندی کے ساتھ

پیدا کی ہے، جس میں کسی قسم کا نقص یا عیب نہیں ہے۔ اس کی ربوبیت وکارسازی سارے جہاں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ جس طرح عالم جمادات وسماوات کا رب ہے اسی طرح وہ عالم حیوانات ونباتات کا بھی رب ہے۔ وہ مظاہر عالم کی صرف تخلیق ہی نہیں کرتا بلکہ ان کے طبیعی ضوابط بھی مقرر کرکے ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتا ہے جیسا کہ حسب ذیل آیات کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے:

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (فرقان: ۲)
اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک (طبیعی) ضابطہ مقرر کیا۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (زمر: ۶۲)
اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور ہر چیز کا نگہبان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ونگرانی ایک لمحے کے لیے بھی اگر اپنی مخلوقات سے ہٹ جائے تو پھر یہ سارا نظام آن کی آن میں منتشر وپراگندہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی مخلوقات اور ان کی دیکھ بھال سے کبھی غافل نہیں رہتا۔

ربوبیت کی ہمہ گیری

غرض اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کے ذریعہ سارے جہاں پر حکمرانی کر رہا ہے اور اس کی ربوبیت وکارسازی اتنی ہمہ گیر ہے کہ اس جہان آب وخاک کی کوئی بھی مادی شے مطلق وآزاد نہیں ہے بلکہ ہر ایک مظہر فطرت طبیعی ضوابط کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اپنے خالق وکارساز کے اشاروں پر سرگرم عمل ہے اور اس کے حکم سے ذرا بھی سرتابی نہیں کر سکتا۔ اسی بنا پر ارشاد ہے:

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (البقرہ: ۱۱۶)
ہر ایک (مظہر فطرت) اس کی بارگاہ میں جھکا ہوا ہے۔

یعنی طبیعی اعتبار سے اس کا مطیع و فرمانبردار ہے، اسی بنا پر وہ سارے جہان اور تمام مظاہر کائنات کا رب قرار پاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی پہلی سورت کی پہلی ہی آیت میں اس حقیقت کی راز جوئی اس طرح کی گئی ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (فاتحہ: ۱) — تعریف کا مستحق اللہ ہے جو تمام عالموں کا رب ہے۔

اور رب کے مفہوم میں اشیائے عالم کی تخلیق و تربیت اور نگرانی و کارسازی کا وسیع مفہوم پایا جاتا ہے، جس کی تعبیر "ربوبیت" کے مفہوم سے کی جاتی ہے اور حسب ذیل آیت کریمہ کے مطابق اپنی مخلوقات پر حکم چلانا بھی ربوبیت میں شامل ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (اعراف: ۵۴) — ہاں تو جان لو کہ پیدا کرنا اور حکم چلانا اسی کا کام ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے وہ جو سارے جہان کا رب ہے۔

ایک خلاق و کارساز ہستی

اس اعتبار سے نباتات (پیڑ پودوں) کا خالق و مربی، ان کا ضابطہ ساز اور ان کی نگرانی و دیکھ بھال کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو اپنی ربوبیت کے اظہار کی غرض سے طبیعیات کی دنیا میں فوق الطبیعی کرشمے دکھا رہا ہے اور ان ضوابط کے ملاحظہ سے انسانی عقلیں چکرا جاتی ہیں، لہذا لامحالہ طور پر ایک فوق الفطرت ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ اس عالم رنگ و بو میں ہر سو اس کی صناعیوں اور گلکاریوں کے نظر افروز جلوے بکھرے ہوئے ہیں جو واقعتاً "معجزاتِ ربوبیت" میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ غرض اس موقع پر دنیائے نباتات سے متعلق چند ایسے حقائق پیش کرنا مقصود ہے جن کو جدید سائنس نے دریافت تو کر لیا ہے مگر مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے

وہ ان کی توجیہ و تعلیل سے قاصر ہے۔ لہذا یہ معمے صرف اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں جبکہ ان تحیر خیز مظاہر کے ظہور کے لیے ایک خلاق و کارساز ہستی کا وجود تسلیم کر لیا جائے۔

پتیوں کا حیرت ناک عمل

چنانچہ ہم سب سے پہلے پتیوں کے عمل کا مظاہرہ کریں گے جو عالم نباتات کا ایک بنیادی اور مشترک عمل ہے۔ جدید سائنس نے خوردبین کی مدد سے بڑی باریک بینی کے ساتھ تجربہ و مشاہدہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ پتیوں میں ایسے ذرات پائے جاتے ہیں جن میں ہرے رنگ کا ایک مادہ ہوتا ہے جسے کلوروفل کہتے ہیں اور انہی ہرے رنگ کے ذرات کی بنا پر پتیاں ہری دکھائی دیتی ہیں۔ نیز انہی پتیوں میں بے شمار ننھے ننھے سوراخ بھی ہوتے ہیں جن کے ذریعہ فضا میں پائی جانے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ اندر جاتی اور آکسیجن باہر آتی ہے، کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس عمل میں ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ پتیوں کے اندر پائے جانے والے یہ ہرے رنگ کے ذرات ایک عجیب و غریب کرتب دکھاتے ہیں، چنانچہ وہ جڑوں اور ڈالیوں کی مدد سے حاصل کردہ پانی میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کو سورج کی روشنی کی مدد سے گھول کر ایک میٹھا سارس دار مادہ تیار کر دیتے ہیں جسے مواد نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ ایک ناکارہ اور بے ذائقہ چیز ہے اور اس کی زیادتی انسان اور حیوان کے لیے ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ مگر اسی بے کار اور مضر چیز سے ایک خوش ذائقہ مادہ تیار کر دینا ربوبیت کا ایک انوکھا کارنامہ ہے، جس کی صحیح حقیقت تک سمجھنے سے سائنس داں عاجز ہیں۔ چنانچہ ایک ماہر سائنس اس سلسلے میں صاف صاف اعتراف کرتا ہے کہ انسان پتیوں کے اس اندرونی عمل کی حقیقت سے ناواقف ہے۔

Unfortunately , we do not understand the

machanism of this process . (Coll Physiology and Biochemistry , P . 111)

غرض ہر درخت کی ہر پتی اپنی جگہ پر ایک مکمل فیکٹری کی طرح کام کرتی ہے اور مشترکہ عمل کے ذریعہ بہت سی پتیاں مل کر پھول اور پھل تیار کرتی ہیں۔ واضح رہے ہماری غذا ترکاریوں اور پھلوں وغیرہ کا اکثر و بیشتر حصہ مواد نشاستہ پر مشتمل ہوتا ہے اور دنیا بھر میں پائے جانے والے لاکھوں قسم کے نباتات میں یہ عمل یکساں طور پر پایا جاتا ہے جو انسانی دانش کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کرنے والا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ۔ (انعام : ۱۰۲)

یہی ہے اللہ تمہارا رب، اس کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ لہذا تم اسی کی عبادت کرو۔ وہ ہر چیز کا نگراں ہے۔

آکسیجن کا تبادلہ و تناسب

نیز پتیوں کا ایک دوسرا عمل بھی ہے جو اس سے بھی زیادہ حیرتناک ہے، چنانچہ ہرے رنگ کے تمام پیڑ پودے مذکورہ بالا عمل کے ذریعہ فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرکے ایک تو مواد نشاستہ تیار کرتے ہیں اور دوم آکسیجن کو فضا میں خارج کردیتے ہیں۔ اگر پودے آکسیجن خارج نہ کرتے تو آپ جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ فضا میں پائی جانے والی تمام آکسیجن بتدریج ختم ہوجاتی اور پھر حیوانی و انسانی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتیں۔ کیونکہ نباتات کے برعکس تمام حیوانات سانس کے ذریعہ آکسیجن لے کر کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں اور اس دوطرفہ عمل کے باعث فضا میں توازن قائم ہے۔ غور فرمائیے خلاق ازل کی یہ کتنی بڑی رحمت و مہربانی ہے کہ

جو چیز ہمارے لیے غیر ضروری تھی اسے نباتات کی غذا بنادی اور جو چیز نباتات کے لیے غیر ضروری تھی اسے حیوانات کی بقا کا ذریعہ بنادیا چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی میزانِ عدل کا ایک واضح نشان ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ۔ (رحمٰن : ۷ - ۸)

اور اس نے آسمان کو بلند کرکے اس میں میزان رکھ دی ہے۔ اور تمام مظاہر فطرت کو حکم ہے کہ تم اس میزان سے تجاوز کرو۔

ایک سائنس داں نے حساب لگاکر بتایا ہے کہ ایک سال میں سبز پودے مذکورہ بالا عمل کے ذریعہ ایک لاکھ پچاس ہزار ملین ٹن کاربن استعمال کرکے تقریباً چار لاکھ ملین ٹن آکسیجن خارج کرتے ہیں۔ (اسیموس گائیڈ ٹو سائنس، ۲/۱۱۵)

اسی لیے ارشاد باری ہے:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ۔ (نمل : ۸۸)

یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو استحکام بخشا ہے۔

وجود خداوندی کی ایک حیرتناک دلیل

پتیوں کے مذکورۂ بالا فعل میں ایک تیسری حقیقت ملاحظہ ہو جو حیرتناک ہی نہیں بلکہ عبرتناک بھی ہے، جس کے مشاہدہ سے مادیت کی چولیں ہل جاتی ہیں اور چاروناچار ایک کرشمہ ساز ہستی کا وجود تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ کیا آپ جانتے ہیں کہ آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کیا ہے؟ جسے اندر باہر کرکے پودے اپنی جادوگری دکھاتے ہیں؟ کاربن ڈائی آکسائیڈ (Co 2) کا مطلب ہے ایک ایسا سالمہ (مالیکیول) جس میں کاربن کا ایک اور آکسیجن کے دو جواہر (ایٹم) ہوتے ہیں۔ اب سبز ذرات جو کچھ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ کاربن کو تو وہ اپنی غذا کے طور پر خود رکھ لیتے ہیں، مگر

آکسیجن کے سالمے (O_2) کو واپس کر دیتے ہیں اور تمام پودوں اور درختوں میں (جو لاکھوں کی تعداد میں ہیں) یہی مشترکہ عمل ہو رہا ہے، جس میں کبھی کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا۔ سائنسی نقطۂ نظر سے یہ ایک مبہوت و ششدر کر دینے والا عمل ہے جو تمام نباتات میں یکساں طور پر ہو رہا ہے تمام قسم کے پودے دن رات مصروف رہ کر مواد نشاستہ دھڑا دھڑ تیار کر رہے ہیں اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہر نوع کی خاصیت مختلف ہونے کے باوجود پورے عالم نباتات میں مواد نشاستہ کا کیمیائی فارمولا مشترک ہے۔ یعنی مواد نشاستہ کا ایک سالمہ کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن کے بالترتیب ۶، ۱۲ اور ۶ جواہر سے مرکب ہوتا ہے، جس میں کبھی تفاوت نہیں ہوتا۔ گویا کہ ان کے اندر کوئی انجینئر بیٹھا ہوا ہے جو ایٹموں کو گن گن کر ڈال رہا ہے اور گویا کہ انواع و اقسام کے یہ تمام درخت اور پودے کسی ایک ہی کارخانے کے مزدور یا کارندے ہیں۔ بہر حال اگر ان کی تعداد یا ترتیب میں ذرا سا بھی فرق آجائے تو چیزیں کچھ سے کچھ ہو سکتی ہیں اور غذا زہر بھی بن سکتی ہے۔

چنانچہ دنیائے کیمیا کا ایک اور عجوبہ ملاحظہ ہو کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) اور کاربن مونو آکسائیڈ (CO) میں صرف ایک جوہر کا فرق ہے۔ اول الذکر میں کاربن کا ایک اور آکسیجن کے دو جواہر ہوتے ہیں، جب کہ آخر الذکر میں کاربن کا ایک اور آکسیجن کا بھی ایک ہی جوہر ہوتا ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے برعکس کاربن مونو آکسائیڈ ایک انتہائی زہریلی گیس ہے؟ اب فرض کیجئے پیڑ پودے بجائے آکسیجن (O) خارج کرنے کے کاربن مونو آکسائیڈ (CO) خارج کرتے تو تمام حیوانات اس میں سانس لینے کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے اور کوئی بھی متنفس زندہ نہ رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نباتات پورے "شعور" کے ساتھ اپنا یہ فعل انجام دے رہے ہیں۔ تو اب سوال

یہ ہے کہ نباتات میں اتنا شعور کہاں سے آیا کہ وہ ہمیشہ اس عمل کو بغیر کسی کوتاہی کے یکساں طور پر دہرایا کریں؟ کیا ایک اندھا بہرا مادہ اس قدر شعور و تعقل کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی بھی جواب ایک خدائے برتر کا وجود تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہ سب تماشائے ربوبیت ہیں۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (رحمٰن) تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔

جڑوں کے عمل میں خدائی کرشمے

آپ پھلوں اور میووں کا کیمیائی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیجئے تو اس میں مختلف قسم کے نمکیات (منرل سالٹس) بھی ملیں گے، جیسے کیلشیم، پوٹاشیم، فاسفورس اور لوہا وغیرہ جو زمین کے اندر پانی میں گھلے ملے رہتے ہیں اور جب جڑیں زمین کا پانی چوس کر ڈالیوں کی مدد سے پتیوں تک پہونچاتی ہیں تو یہ نمکیات بھی غذا میں شامل ہو کر اس کا جزء بن جاتے ہیں اور یہ انسانی صحت کو برقرار رکھنے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں لیکن ہر پھل اور میوے میں ان کا تناسب مختلف ہوتا ہے مثلاً فاسفورس ہر سو گرام بادام میں ۵۰۴ ملی گرام، سیب میں ۱۰ ملی گرام، گاجر میں ۳۶، کاجو میں ۳۷۳، کافی میں ۳۸۳، ککڑی میں ۲۷، انگور میں ۱۲، زیتون میں ۱۷، اور مٹر میں ۲۶۸ ملی گرام پایا جاتا ہے۔ اسی طرح سوڈیم ہر سو گرام بادام میں ۴، سیب میں ۱، گاجر میں ۴۵، کاجو میں ۱۵، کافی میں ۲۷، ککڑی میں ۶، انگور میں ۳، زیتون میں ۳۸ ور مٹر میں ۴ ملی گرام ہوتا ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ ہر پودا ہر چیز ایک متعین مقدار ہی میں لیتا ہے اور اس میں کبھی کوئی غلطی نہیں کرتا۔ حالانکہ پانی میں ہر قسم کے نمکیات گھلے ملے رہتے ہیں اور سب کے سب ایک ہی خطۂ ارض میں سیراب کیے جاتے ہیں تو اب مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے قدرت کے

اس عجیب وغریب عمل کی توجیہ کسی بھی طرح نہیں ہوتی کہ آخر ہر نوع کا پودا صرف اپنی ہی آبائی خصوصیت کے مطابق بغیر کسی ادراک واحساس کے کس طرح یہ نمکیات گن گن کر حاصل کر رہا ہے، تو کیا ان کی جڑوں میں کسی قسم کا میٹر لگا ہوا ہے ؟

ظاہر ہے کہ یہ پوری دنیائے سائنس کیلئے ایک چیلنج ہے کہ وہ اس معمہ کو حل کرے ۔ مگر وہ ایک عظیم ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر اس مظہر قدرت کی گرہ کشائی نہیں کر سکتی ۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ — یہی ہے اللہ تمہارا رب، سارا اقتدار
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ — اسی کے پاس ہے، اس کے سوا دوسرا
(زمر: ۶) — کوئی معبود نہیں، تو تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو؟

واقعہ یہ ہے کہ سائنس ہمیں مظاہر عالم کا صرف ایک تصوراتی ڈھانچہ ہی دے سکتی ہے، حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کر سکتی ۔ جیسا کہ تاریخ سائنس کا مصنف ڈامپیر اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کرتا ہے :

Science gives only a conceptual model of Phenomena and enables us only to trace a routine sensations.(A History of Science . P 472)

رنگوں کے اختلاف میں دلیل ربوبیت

عالم نباتات میں چار لاکھ سے زیادہ پیڑ پودے پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض غذا کے کام آتے ہیں تو بعض ترکاریوں کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض روغنیات کی حیثیت سے مستعمل ہوتے ہیں تو کچھ مصالحہ جات کے طور پر۔ چند شیریں وخوش ذائقہ پھلوں کی شکل میں کام ودہن کو لذت آشنا کرتے ہیں تو کچھ دواؤں کے طور پر کام آتے ہیں۔ بعض مویشیوں کے لیے چارہ فراہم کرتے ہیں

تو بعض دیگر بہت سی تمدنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ غرض انواع واقسام کے پیڑ پودے اپنی مختلف طبیعی خصوصیات کی بنا پر انسانی وحیوانی ضروریات کو اس طرح پورا کرتے ہیں کہ ہمیں اس کارخانۂ ربوبیت میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی، مگر اس سلسلے میں ربوبیت کا کمال یہ ہے کہ گوناگوں خصوصیات کے حامل قسم ہا قسم کے یہ درخت اور پودے ایک ہی پانی سے سیراب ایک ہی مٹی اور ایک ہی خطۂ ارض میں اُگتے اور ایک ہی سورج سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے رنگ وروپ مختلف، سراپا جدا جدا، شکل وصورت الگ الگ اور خواص وتاثیرات ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہاں پر ربوبیت وخلاقیت کارفرما نہ ہوتی تو پھر یہ اختلافِ رنگ ولون، اختلافِ لذت وذائقہ اور اختلافِ خصائص ممکن نہ ہوتا۔ اسی بنا پر اختلافِ الوان اور اختلافِ خواص وتاثیرات کو دلیل ربوبیت قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے :

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ — اے مخاطب کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا
السَّمَآءِ مَآءً ج فَاَخْرَجْنَا بِهٖ — کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر
ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۔ — ہم نے اس پانی کے ذریعہ رنگ برنگے
(فاطر: ۲۷) — پھل نکال دیے۔

چنانچہ بعض دیگر مقامات میں صراحت موجود ہے کہ عالم نباتات کی ان رنگارنگیوں اور ان میں ودیعت شدہ حیرت انگیز خواص میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت وخلاقیت کی نشانیاں ودیعت کر دی گئی ہیں جو مخلوق پروری کے طور پر ہیں :

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا — اور اس نے تمہارے لیے زمین میں

اَلْوَانُہٗ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ۔	جو رنگ برنگی چیزیں پھیلا رکھی ہیں ان میں جو نکتے والوں کے لیے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔
(نحل: ۱۳)	
وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَہَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔	اور زمین میں ایسے خطے بھی ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور انگور کے باغ، کھیتیاں اور کھجور کے شاخ دار درخت ہیں، جو (سب کے سب) ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں۔ لیکن ہم ذائقہ میں ایک پھل کو دوسرے سے برتر رکھتے ہیں۔ اس باب میں عقلمندو کے لیے بڑی نشانیاں موجود ہیں۔
(رعد: ۴)	

اختلافِ خواص میں وجودِ باری کا نظارہ

چنانچہ طبی نقطۂ نظر سے ان انواع و اقسام کے پھلوں میووں، غذائی، جناس، ترکاریوں، مختلف قسم کے مصالحہ جات اور جڑی بوٹیوں کا جائزہ لیا جائے تو ایسے بے شمار حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں جو صانعِ عالم کی حکمت تخلیق اور اس کی حیرت انگیز ربوبیت ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ روئے زمین پر پائے جانے والے ہزاروں لاکھوں درختوں کے خواص مختلف ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا ذائقہ دوسرے سے مختلف اور اس کی تاثیر جدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ایک کا چہرہ مہرہ اور رنگ روپ الگ الگ اور بوباس جداجدا ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب، ایک ہی زمین اور ایک ہی ہوا میں اگتے بڑھتے ہیں تو پھر ان گھائے رنگ رنگ اور

اختلاف خواص کی توجیہ ایک برتر ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر کس طرح ہو سکتی ہے؟ ہر پیڑ پودا ایک لگے بندھے اصول کے تحت ہزاروں سال سے اپنی نوعی خصوصیات آخر کس طرح دہرائے چلا جا رہا ہے جس میں ایک سر مو بھی فرق نہ آتا ہو؟ چنانچہ آپ ایک قطعۂ ارض میں پچاس قسم کے پودے بو دیجیے، ہر ایک اپنے نیچر اور طبیعت کے مطابق برآمد ہوگا اور دوسرے کا اثر کبھی قبول نہیں کرے گا۔ مثال کے طور پر آم امرود کے اثرات کبھی قبول نہیں کرے گا اور امرود انار کے درخت سے ہرگز متاثر نہ ہوگا۔ سنترہ سیتا پھل کا رنگ کبھی نہیں اختیار نہیں کرے گا۔ اسی طرح پپیتا ناریل یا ناریل پپیتا کبھی نہیں بن سکے گا۔ وقس علیٰ ذٰلک۔

اسی طرح کوئی پھل اپنے مزاج کے اعتبار سے گرم و تر ہوتا ہے جیسے: انجیر، بادام، پستہ، کھجور اور کاجو، تو کوئی گرم و خشک ہوتا ہے جیسے اخروٹ، انگور اور مونگ پھلی۔ اس کے برعکس کوئی پھل سرد و تر ہوتا ہے جیسے امرود، انار، اننناس، سنترہ، تربوز، ککڑی اور لیموں، تو کوئی سرد و خشک ہوتا ہے جیسے آم اور جامن۔

غرض یہ وہ عجائباتِ قدرت ہیں جن کی بنا پر ایک حیرت انگیز افعال والی ہستی کا وجود تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا ہے:

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ۔ (زمر: ۶۲)	اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور ہر چیز کا نگراں ہے۔

نیز اسی طرح ہر غلے، پھل اور میوے کے فوائد جدا جدا رکھے گئے ہیں۔ کوئی ایک بیماری کے لیے مفید ہے تو کوئی دوسری بیماری کے لیے تریاق کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ جتنی بھی انسانی اور حیوانی بیماریاں ہیں ان سب کا علاج پودوں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے چاہے

طب قدیم ہو یا طب جدید۔ مثال کے طور پر پنسلین جیسا قیمتی انجکشن کائی جیسی ایک معمولی چیز سے بنتا ہے جو تالابوں اور سمندروں میں اُگتی ہے اور اس اعتبار سے کارخانۂ ربوبیت میں کوئی بھی چیز بیکار اور بلا وجہ نہیں ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (آل عمران: ۱۹۱) — اے ہمارے رب یہ سب کچھ تونے بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔

قرآن کی جامعیت کا ایک حیران کن نمونہ قرآن حکیم کا اصلی اعجاز یہ ہے کہ وہ نہایت درجہ مختصر الفاظ میں ایسے جامع اصول بیان کر دیتا ہے جو مختلف علوم و ابواب کے عناوین کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی شرح و تفصیل میں متعلقہ علوم کے دفتروں کو کھنگالنا پڑتا ہے چنانچہ حسب ذیل آیت کریمہ ایک ایسے ہی جامع ترین کلیہ پر مشتمل ہے جس کی شرح میں پوری نباتاتی سائنس (باٹنی) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ اس میں نباتاتی سیرتوں کی پوری روح یا ان کی تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے اور یہ جامع اصول دنیائے نباتات کے لیے طبعی و کیمیائی حیثیت سے ایک شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس پیمانے کے ذریعہ تمام نباتاتی مظاہر کو طبعی و کیمیائی اعتبار سے ناپا اور تولا جا سکتا ہے اور یہ کلیہ ہر حیثیت سے عالم نباتات پر صادق آئے گا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (حجر: ۱۹) — اور ہم نے زمین میں ہر چیز وزن کی ہوئی پیدا کی ہے۔

اس موقع پر "شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ" کے الفاظ حد درجہ بلیغ اور معنی خیز ہیں اور ان کا مفہوم ہے: "ایک معین مقدار" یا "نپی تلی چیز"۔ اس آیت کریمہ کا ایک محدود مفہوم ہے اور ایک وسیع مفہوم اور ان دونوں اعتبارات سے اس موقع پر مختصر بحث کی جاتی ہے کیونکہ

تفصیلی بحث کے لیے ضخیم جلدیں درکار ہوں گی اور پھر بھی تشنگی باقی رہے گی۔

بہر حال اس کا محدود مفہوم یہ ہے کہ اس کلیہ کو غذا اور پھلوں پر محمول کیا جائے چنانچہ غذا میں چند بنیادی مادے ہوتے ہیں جن کو سائنس کی اصطلاح میں مواد لحمیہ (پروٹینز)، مواد نشائیہ (کاربوہائیڈریٹس)، مواد شحمیہ (فیٹس)، معدنی نمکیات (منرل سالٹس) اور حیاتین (وٹامنز) کہتے ہیں اور یہ مادے مختلف اشیاء میں مختلف تناسب کے ساتھ مرکب ہوتے ہیں، جن کی کمی بیشی کی وجہ سے ان کی خصوصیات بدل جاتی ہیں۔ گویا کہ ان میں یہ مادے تول تول کر اور ناپ ناپ کر ڈالی جا رہی ہیں اور ان کی یہ خصوصیات ہمیشہ برقرار رہتی ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل چند منتخب اشیاء کا ایک غذائی چارٹ ملاحظہ ہو جس کے ذریعہ ربوبیت کی کاریگری کا پتہ چلے گا۔

	مواد لحمیہ	مواد نشائیہ	مواد شحمیہ
گیہوں	۱۱ر۸ فیصد	۷۱ر۲ فیصد	۱ر۵ فیصد
چاول	۷ر۵ ″	۷۸ر۷ ″	۰ر۰۱ ″
مٹر	۱۹ر۷ ″	۵۶ر۶ ″	۰ر۰۷ ″
مونگ	۲۴ر۹ ″	۶۰ر۱ ″	۳ر۲ ″
گاجر	۰ر۹ ″	۱۰ر۷ ″	۰ر۲ ″
کھجور	۳ ″	۶۷ر۳ ″	۰ر۲ ″
انگور	۰ر۸ ″	۱۰ر۲ ″	۰ر۱ ″

معدنی نمکیات میں کیلشیم کا تناسب ملاحظہ ہو، ہر سو گرام خشک بادام میں وہ ۲۳۴ ملی گرام، سیب میں ۷، خوبانی میں ۳۱، گاجر میں ۳۸، کھجور میں ۵۹، زیتون میں ۸۴

انار میں ۳، آم میں ۱۰ اور لیموں میں ۳۳ ملی گرام پایا جاتا ہے۔

اسی طرح پوٹاشیم ہر سو گرام بادام میں ۷۷۳، سیب میں ۱۱۰، کیلے میں ۳۷۰، کاجو میں ۴۶۴، کھجور میں ۶۴۸، انگور میں ۱۵۸، انجیر میں ۱۹۴، زیتون میں ۵۵، مٹر میں ۸۹۵، تربوز میں ۱۰۰، نارنگی میں ۲۰۰، انار میں ۲۵۹ اور لیموں میں ۱۰۲ ملی گرام کی مقدار میں پایا جاتا ہے (ایک ملی گرام ایک گرام کا ایک ہزارواں حصہ ہے)۔

غرض تناسب کے انہی تمام اختلافات کی وجہ سے غلوں اور پھلوں کا ذائقہ اور انکے خواص بدل جاتے ہیں اور پھر ان غذائی مادوں کا "سالماتی" نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ مختلف عناصر و جواہر ان مادوں کو تشکیل دینے میں کتنی "سوجھ بوجھ" اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ سب وسیع علوم ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عناصر اور سالمات کی دنیا جادو کی نگری یا طلسم ہوش ربا سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے ان تمام اعتبارات سے "شَیْئٍ مَّوْزُوْنٍ" ایک ہمہ گیر اور صداقت سے بھرپور کلیہ ہے۔

نباتات کا نپا تلا انداز

آیت کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ یہ کلیہ نباتات کے تمام مظاہر پر پوری طرح صادق آتا ہے، خواہ اس کا تعلق جڑوں اور تنوں سے ہو یا ڈالیوں اور پتیوں سے، غنچوں سے ہو یا پھولوں اور پھلوں سے۔ پیڑ پودوں سے تعلق رکھنے والی ہر چیز ایک خاص شکل و صورت اور ایک متعین مقدار کے ساتھ زمین سے نمودار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر پیڑ پودے کے چار اعضا ہوتے ہیں: جڑ، تنا، ڈالیاں اور پتیاں۔ پھر ایک مخصوص وقت میں ان میں پھول اور پھل ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ کسی نوع کا ایک ننھا سا بیج مرطوب زمین میں دبا دیجئے تو اس کے برگ و بار اپنی مخصوص نوعیت کے مطابق نمودار ہوں گے۔ ڈالیاں اور شاخیں بالکل اسی انداز میں ظاہر ہوں گی جو اس کی نسلی خصوصیات کے

عین مطابق ہوگی۔ اس کی ہر پتی ایک ہی تراش خراش اور ایک ہی سائز کی ہوگی۔ گویا کہ کسی ماہر کاریگر نے انہیں چھیل چھیل کر اور تراش تراش کر بنایا ہے۔ آپ کسی ایک ہی نوع کے ہزاروں بیج بو دیجئے اس نوع کے ہزاروں درختوں میں کسی قسم کا فرق نہ ہوگا اور یہ یکسانیت ایک نامعلوم مدت دراز سے اسی طرح قائم ہے۔ ہر نوع کی جڑ، تنا، ڈالیاں، شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل سب کے سب اپنی نوعی خصوصیات کے ساتھ اپنا وظیفۂ حیات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے تناسب اور رکھ رکھاؤ میں کسی قسم کی بے قاعدگی نظر نہیں آرہی ہے۔ چنانچہ پتیوں ہی کو دیکھ لیجئے کسی درخت کی پتی لمبی ہوتی ہے تو کسی کی چوڑی، کوئی بہت بڑی ہوتی ہے تو کوئی ننھی منی، کوئی منقش ہوتی ہے تو کوئی سیدھی سادی، کوئی گول گول ہوتی ہے تو کوئی سوئی جیسی۔ مثال کے طور پر آپ آم، انجیر، پپیتے، ناریل، نیم، پیپل، املی، کیلے، ببول اور سرو کی پتیوں کی بناوٹ اور ان کے اختلافات دیکھئے تو ہر ایک میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ بعض درخت اور پودے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان کی تمام شاخیں اور ڈالیاں جڑ تک کاٹ دی جائیں تو پھر ان کے اندر سے ویسی ہی ڈالیاں، پتیاں اور پھل پھول برآمد ہوتے ہیں جو ان میں پہلے سے موجود تھے اور ان کی صورت و سیرت میں ایک سر مو بھی تفاوت نہیں ہوتا۔ حتی کہ ان میں موجود کانٹے بھی دوبارہ اسی طرح اور انہی مقامات پر نکل آتے ہیں، جیسے گلاب کا پودا۔ اس اعتبار سے نباتات کے تمام اعضا ایک متعین شکل و صورت، نپی تلی مقدار اور منصوبہ بند تناسب کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں اور انہیں ایک موزوں و مناسب قالب عطا کیا جاتا ہے، گویا کہ ہر چیز ناپ کر اور تول تول کر پیدا کی جا رہی ہے۔ غرض ان تمام اعتبارات سے "شَیْئٍ مَّوْزُوْنٍ" ایک حقیقت افروز کلیہ ہے اور اس کی ایک تعبیر یہ بھی ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ۔ (رعد : ۸) — اس کے نزدیک ہر چیز ایک خاص مقدار کے ساتھ ہے۔

ایک ہمہ دان ہستی کا ثبوت مذکورۂ بالا حقائق کے ملاحظہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کلام برحق کا "مصنف" کوئی انسان نہیں بلکہ وہی ہستی ہے جس نے یہ رنگارنگ کائنات تخلیق کی ہے۔ اسی بنا پر اس نے اپنی تخلیقات کے تمام بنیادی اصول وضوابط اپنے کلام میں بذریعہ وحی درج کرا دیے ہیں، تاکہ علوم وفنون کی ترقی کے بعد ان کی صداقت ظاہر ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ علوم وفنون کی ترقی سے پہلے اس قسم کے اصول وضوابط وضع کرنا کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا۔ اس سے تین ابدی صداقتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ اس کائنات میں کوئی علیم وخبیر ہستی ضرور موجود ہے جو اس کائنات مادی کے تمام بھیدوں سے واقف ہے یہی خدا ہے چنانچہ قرآن مجید میں صراحت کی گئی ہے کہ اللہ چونکہ تمام اشیاء کا خالق ہے اسلیے وہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ (انعام : ۱۰۱) — اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ایک دوسرے موقع پر استفہامیہ انداز میں اس حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (حج : ۷۰) — کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو جانتا ہے؟

۲۔ قرآن مجید ایک سچا اور برحق کلام ہے جو حقائق ومعارف سے پُر ہے۔

۳۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی تھے جن پر بذریعہ وحی یہ کلام نازل کیا گیا۔

بہرحال ربوبیت کے ان جلوؤں سے مادیت کا رد وابطال اور خدا پرستی کا بول بالا ہوتا ہے اگر یہ کائنات محض "بخت واتفاق" کا نتیجہ ہے تو پھر ان ابدی حقائق کی کیا تاویل کیا ہوگی؟ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (نمل ۶۴)

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

تمدن ہائے قدیم میں جرم وسزا

از

جناب نور احمد شاہتاز صاحب

(۲)

قدیم ہندی تمدن اور جرم زنا جرم زنا میں ماخوذ افراد کے لیے جسمانی سزائیں نافذ تھیں گویا زنا کو جرم قابل عقوبت شدیدہ تصور کیا جاتا تھا، یوں بھی ہندوستان میں زنا کے علاوہ دیگر بعض جرائم میں قطع اعضاء کی سزائیں رائج تھیں ہاشم نے اس پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے وہ کہتے ہیں:

"قطع اعضاء اور جسمانی اذیتیں بہت سے جرائم کے لیے عام سزائیں تھیں اور قانون کے موضوع پر لکھنے والوں نے سزا کی متعدد دوسری شکلوں کا بھی ذکر کیا ہے ان سزاؤں کو ایک طرح کی عقوبت نفس تصور کیا جاتا تھا اور جرائم کی سزا پر غور کرتے وقت سمرتیوں کے لکھنے والوں کے ذہن سے مذہبی عقوبت نفس کا تصور کبھی بھی مکمل طور پر اوجھل نہیں رہا، عام طور پر یہ یقین تھا کہ اس کی زندگی سزا بھگت لینے کے بعد مجرم اپنے جرم کے سلسلہ میں دوسری دنیا کی شدید عقوبتوں سے محفوظ ہوجاتا ہے"[1]

منوسمرتی میں زنا بالجبر کی سزا قطع عضو تناسل ہے لیکن چونکہ برہمنوں کو جسمانی سزا دینے کی ممانعت ہے اس لیے اسی میں سفارش کی گئی ہے کہ برہمنوں کو یہ سزا نہ دینی چاہیے[2] تاہم زنا کے مختلف طریقوں کے لحاظ سے سزا کی مختلف صورتیں مقرر کی گئی ہیں، منو نے

جنسی جارحیت کے مرتکب افراد کی سزا بغاوت اور غداری کے لیے سزائے موت بطرق مختلف تجویز کی ہے۔ یہی صورت حال ہندوؤں کے فیاض اور خیر پسند اشوک کے ہاں بھی ہے وہ باوجودیکہ سزائے موت کو سخت ناپسند کرتے ہیں، زنا کے معاملہ میں سزائے موت کو انہوں نے کبھی ختم نہیں کیا۔

زنا بالجبر کی صورت میں اگرچہ منوسمرتی میں قطع تناسل کی سزا تجویز کی گئی ہے تاہم ہندوستانی معاشرہ میں ایسے زانی کو قتل کرنے کا نظام بھی رائج رہا ہے۔ ہاں البتہ اگر زنا شوئی کا عمل عورت کی رضامندی سے ہوا ہو تو اس صورت میں زانی اور زانیہ دونوں واجب القتل ٹھہرتے ہیں۔ زانی محصن کو قتل کرنے کی سزا تو قدیم ہندوستان میں کم وبیش ہر حکومت میں رائج رہی ہے۔

سزائے موت کے لیے زانی کو بر سر عام لوہے کے تپتے ہوئے پلنگ پر لٹا کر جان سے مار دینے اور زانیہ کو جیتے جی کتوں سے پھڑوا دینے کا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا تھا۔

قرون وسطی میں ہندوستان میں جلاوطنی و جرمانہ، قید، قطع اعضا جیسی سزائیں دی جاتی تھیں، تاہم برہمن سخت قسم کی سزاؤں سے محفوظ رہتے تھے۔ صیغۂ انصاف کے لیے الگ افسر ہوتا اور اس کے ماتحت مختلف مقامات اور صوبہ جات میں اہلکار ہوتے جو نظام جرم وسزا کے قائم کرنے کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔

البیرونی کہتا ہے کہ ہندوستان میں بدکار عورت کو خاوند کے گھر سے نکال کر ملک بدر کر دیا جاتا اور شراب خوری پر سزا دی جاتی تھی، وہ کہتا ہے:

"عقوبۃ الزانیۃ ان تخرج من بیت الزوج وتنفی وکنت اسمع ان من یھرب من السمائیک الھندیین عائد الی بلادھم ودینھم یفرض علیہ کفارۃ صیام وینقع فی اخثاء البقر وابوالھا والبانھا ایاما معدودۃ

حتی یختمر فیھا ویخرج من النجاسۃ ویطعم ما یشبہ ما ھو فیہ وامثال ذلک"

۵۔ قدیم تمدن ایران اور جرائم کی سزائیں ایرانی تمدن کا آغاز نویں صدی قبل مسیح سے ہوتا ہے جب آریا نسل میڈیا کے علاقوں میں آباد ہوئی۔ یہ لوگ ماد کہلائے ان کی حکومت کا پایہ تخت سوسہ تھا جو دریائے فرات کے مشرق اور خلیج فارس کے شمال میں واقع تھا۔ ۵۴۶ یا بعض مورخین کے بقول ۵۵۵ ق م میں اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کا آخری بادشاہ آستیاکس (ASTY-AGES) تھا جس پر ہخامنشی خاندان کے خورس یا کورش اعظم نے فتح پائی۔

کوروش اعظم (۵۴۹ - ۵۲۹ ق م) عہد ہخامنشی کا موسس مانا جاتا ہے۔ جبکہ ۳۳۶ - ۳۲۳ ق م ہخامنشی عہد کے عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ایران ۲۴ سے ۳۰ صوبوں پر مشتمل تھا۔

اس زمانے میں بادشاہ، قوانین سلطنت امرائے سلطنت کے مشورے سے بناتا تھا۔ جرائم کی سزائیں بہت سخت تھیں۔ قتل، زنا اور بغاوت جیسے جرائم کی سزا موت تھی، دیگر سزاؤں میں کوڑے مارنا، زہر دینا، اندھا کرنا، قید کر دینا، داہنا ہاتھ یا پاؤں کاٹ دینا اور اسی قسم کی دوسری سزائیں شامل تھیں، کوڑوں کی سزاؤں میں ہر کوڑے کے بدلے چھ روپے ادا کرنے پر کمی ہو سکتی تھی۔

عدل وانصاف کے لیے مملکت میں اہل دیانت افراد کو داد ور کے عہدہ پر فائز کیا جاتا تھا داد وہ سے اوپر دیوان عالی تھا جو بادشاہ یا اس کے کسی نائب کے ماتحت ہوتا تھا۔

قدیم تمدن ایران میں نظام جرم وسزا کیا تھا؟ تاریخی مصادر ومراجع اس سلسلہ میں ساسانی عہد تک تو شواہد مہیا کرتے ہیں تاہم اس سے ماقبل کے احوال کے بارے میں

یقینی اور قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایران کے معروف مورخ عبداللہ رازی ساسانی عہدِ حکومت کے نظامِ جرم و سزا سے متعلق لکھتے ہیں:

"مرتکب جرم دو قسم مجازات داشتہ، مجازات دنیوی و مکافات اخروی۔

مجازات دنیوی عبارت بود از اعدام (مرگ ارزان) یا تازیانہ (تعداد ضربت بر حسب نوع جرم یا خلاف متفاوت بودہ) زنجیر زندان اعمال شاقہ داغ و مثلہ ہم در موارد مخصوص اجرا می گشت"[11]

یعنی مجرم کو دو طرح کی سزا ملے گی ایک دنیاوی اور دوسرے اخروی' دنیاوی سزا کا تعلق سزائے موت یا درہ زنی وغیرہ سے ہے۔ (کوڑوں کی تعداد جرم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اور کم و بیش مقرر ہے) علاوہ ازیں قید و بند اور قید با مشقت یا داغنا یا مثلہ وغیرہ کرنا ہے جو کہ مخصوص حالات میں دی جاتی ہے۔

ساسانی دور حکومت میں مجرموں کو قید اور کوڑوں کی سزاؤں کے علاوہ قطعِ اعضاء کی سزا کا قانون موجود تھا، اگر کوئی سارق کسی کا مال چراتا تو چور سے بجائے ایک درہم کے دو درہم یعنی مال مسروقہ سے دوگنا وصول کرنے کا قانون تھا، علاوہ ازیں چور کے کان کی لو بھی کاٹ دی جاتی تھی اور دس کوڑے بھی لگائے جاتے تھے اگر چور دوبارہ چوری کرتا تو اسے پہلے سے دوگنا جرمانہ کیا جاتا اور پورا کان کاٹ دیا جاتا تھا بیس کوڑے بھی لگائے جاتے اور قید کی سزا بھی دی جاتی، یہ صرف ایک درہم کی چوری کی سزا تھی اور اگر سارق تین یا چار درہم کی چوری کرتا تو اس کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا اور پانچ سو درہم کی چوری پر سزائے موت دی جاتی تھی۔ اس طرح کے قوانین چار سو سال سے زائد عرصہ تک ایران میں

رائج رہے۔[12]

ساسانی عہد میں اوستا اور اس کی تفاسیر اور اجماع نیکاں یعنی "فقہاء کے فتاوی" قانون کے ماخذ تھے اور مجموعۂ قوانین کی کوئی خاص کتاب موجود نہ تھی، تاہم محققین نے ایک قانونی دستاویز کا ذکر کیا ہے جسے فرخ مرد نے "مادیگان ہزار دادستان" کے نام سے تالیف کیا، اس کے صرف چند صفحات ہی دستیاب ہو سکے ہیں جن میں قوانین کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، تاہم قدیم قانونِ جرم و سزا میں تین طرح کے جرائم قابل مواخذہ قرار دیے گئے تھے۔

۱۔ جرائم خلافِ مذہب و خدا ۲۔ جرائم خلافِ بادشاہ یا حکومت ۳۔ جرائم خلافِ عامۃ الناس۔

تیسری قسم کے جرائم میں چوری ڈکیتی وغیرہ شامل تھے جن میں سے بعض میں جسمانی سزائیں اور بعض میں سزائے موت دی جاتی تھیں۔ زنا اور شراب نوشی جرائم میں شمار نہ ہوتے تھے بلکہ حد تو یہ کہ ایک دور ایران پر ایسا بھی گزرا جب قدیم "متمدن ایران" میں زنا کی اجازت سرکاری طور پر دے دی گئی، مزدک نے جو ایرانیوں کا روحانی پیشوا خیال کیا جاتا تھا یہ اعلان کر دیا کہ صرف دو چیزیں انسانوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کرنے کا باعث ہیں جائیداد اور عورت اور چونکہ سب انسان برابر ہیں اس لیے کسی خاص انسان کو کسی خاص جائیداد کے حقوقِ ملکیت حاصل نہیں ہونا چاہئیں اور کوئی عورت کسی ایک شخص کی منکوحہ بن کر نہیں رہ سکتی۔ لہذا ہر شخص ہر قسم کی جائیداد اور ہر عورت سے استفادہ کر سکتا ہے۔[13] یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ایران پر نوشیروان کے باپ کیقباد کی شہنشاہیت قائم تھی۔ علامہ ابن اثیر کے مطابق مزدک کے نظریات کو پروان چڑھانے میں کیقباد کا حصہ زیادہ ہے جس نے ملک کے طول و عرض میں مزدک کی تعلیمات کو فروغ دینے کے وسائل

مہیا کیے اور خود اس کا صد درجہ معتقد تھا۔[۱۷]

اس دور میں زنا اور بدکاری گویا عام تھی اور شراب کھلے بندوں پی جاتی تھی۔ مذہبی تقریبات میں شراب پلانے کا خاصا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاجداران آل ساسان کا دربار شراب نوشی کی بڑی آماجگاہ تھی۔[۱۸]

۲۔ قدیم یونانی تمدن یونانی قوم جس نے سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفر پیدا کیے، ایک مہذب و متمدن قوم ہونے کا شہرہ رکھتی ہے مگر جرم وسزا کے حوالے سے اس قوم کے تہذیب و تمدن کا مطالعہ کیا جائے تو صورت حال کچھ عجیب سی بنتی نظر آتی ہے۔ فلسفہ کی موشگافیوں میں دنیا کو مات دینے کا دعویٰ رکھنے والی قوم کے عظیم سپوت جرائم کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ افلاطون کا بیان اس کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"... شہر کے باشندوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ حکام، لشکر اور عوام الناس پہلے دو طبقے اس مثالی شہر کے نگہبان ہیں۔ داخلی انتشار اور بیرونی حملوں سے بچانا ان کی ذمہ داری ہے، اس لیے ان دو طبقوں کی طرف خصوصی توجہ دی جائے اور ان کو مالی پریشانیوں سے بچانا حکومت کا فرض ہے، اس طرح حکومت پر لازم ہے کہ ان کے دلوں سے خاندانی جذبات کی بیخ کنی کر دے اور انہیں اپنا علیحدہ خاندان بنانے سے قانونی طور پر روک دے۔ حکومت کو خوشگوار اوقات میں ایسے مذہبی تہوار منعقد کرنے چاہئیں جن میں یہ چنے ہوئے مرد صحت وجمال میں ہر طرح ممتاز عورتوں کے ساتھ وقتی طور پر رشتۂ ازدواج قائم کرسکیں اور اس کا مقصد صرف حکومت کے لیے بہترین بچوں کا پیدا کرنا ہو۔ جب وہ عورتیں بچے جنیں تو ان بچوں کو ان سے لے لیا جائے اور تمام بچوں کو ایک مکان میں رکھا جائے، وہ عورتیں آکر انہیں دودھ پلائیں اور

کوئی عورت یہ امتیاز نہ کرے کہ یہ کس کا بچہ ہے اور نہ ان کو پہچان سکے۔ اس طرح اس طبقہ میں کوئی مخصوص رشتہ داری نہیں پائی جائے گی وہ سب ایک خاندان کے افراد شمار ہوں گے۔ سب کے ساتھ یکساں نوعیت کی قرابت داری ہوگی ..."[۱۹]

یونانی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے عموماً یونان کی دو معروف ریاستوں سپارٹا اور ایتھنز کا حوالہ دیا جاتا ہے حالانکہ ان دو ریاستوں کے باشندے ہمیشہ طبقاتی تقسیم کا شکار رہے اور دونوں ریاستوں نے دو مختلف نظام ہائے حکومت کو جنم دیا۔ سپارٹا کے شہریوں کو عسکری تربیت سختی سے دی جاتی تھی اور چشم بد دور تہذیب اس قدر عروج پر تھی کہ جو لوگ جسمانی اعتبار سے عیب دار ہوتے تھے انہیں ایک غار یا پہاڑ کے ویرانے میں چھوڑ آتے تھے تاکہ وہ سردی سے مر جائیں یا درندے انہیں کھا جائیں یا کوئی رحم دل غلام انہیں اپنا بچہ بنالے۔ تندرست بچوں کو دیگر فنون کے ساتھ ساتھ چوری کے فن میں بھی تربیت دی جاتی تھی اور انہیں یہ سکھایا جاتا تھا کہ وہ چوری کرتے ہوئے اپنے آپ کو گرفتاری سے کس طرح بچائیں اور اگر گرفتار ہو جائیں تو کسی صورت بھی اعتراف سرقہ نہ کریں۔ سپارٹا کے ایک چوری کرنے والے بچے کی کہانی یوں بیان کی جاتی ہے کہ "اس نے لومڑی چرائی اسے اپنے کپڑے میں چھپالیا، اکابر اس سے پرسش کرتے رہے، اس اثنا میں لومڑی بچے کا پیٹ کاٹ کاٹ کر کھاتی رہی یہاں تک کہ بچے نے جان دے دی مگر چوری کا اعتراف نہ کیا۔ چنانچہ اس بچہ کو ہیرو کی حیثیت حاصل ہوگئی۔"[۲۰]

محولہ بالا عبارت سے یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ یونانیوں کے ہاں نظام عدل مساوات کے اصول پر قائم نہ تھا بلکہ ہندی تمدن کی طرح ذات پات اور طبقاتی اونچ نیچ کا شکار تھا۔ خود یونانی حکما اس تقسیم کے محرک و موید تھے۔ ارسطو کا بیان اس حقیقت کو اور بھی

آشکار کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"ان القانون لا ینبغی ضرورۃ ان یطبق الا علی افراد متساوبین بالمولد بالملکات غیر ان القانون لم یشرع قط لھولاء الناس الافذاذ انھم ھم انفسھم القانون ومن السخریۃ ان یحاول اخضاعھم للدستور"[۲۱]

یعنی تمام قانون تمام اہل ملک کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس کا مساویانہ انطباق صرف ان افراد پر ہوگا جو نسب اور قابلیت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ رہا حکمراں طبقہ تو ان لوگوں کے لیے قانون نہیں بنایا جاتا بلکہ یہ لوگ بذات خود قانون ہیں اور یہ کھلا مذاق ہے کہ ان اکابر کو دستور کی پابندی پر مجبور کیا جائے۔"[۲۲]

ارسطو نے اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے ایک حکایت بیان کی ہے، وہ کہتا ہے کہ:

"خرگوشوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ تمام حیوانات میں مساوات کا قاعدہ جاری ہونا چاہیے۔ جب شیروں نے یہ ریزولوشن (RESOLUTION) سنا تو انہوں نے کہا کہ پہلے ہمارے جیسے طاقتور پنجے اور تیز دانت لاؤ پھر ہمارے ساتھ مساوات کا مطالبہ کرو۔"[۲۳]

جس تمدن میں عدل کا دوہرا معیار ہو اور مساوات کے اصول کی قوم کے ہیرو نفی کر رہے ہوں وہاں کے نظام جرم وسزا میں افراط وتفریط کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ یونانی تمدن میں مے نوشی اور زنا جرائم کی فہرست میں نہ آتے تھے بلکہ انہیں افلاطون جیسے شہرۂ آفاق فلاسفر کی سرپرستی حاصل تھی۔ سرقہ کو بھی جرم نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کی تربیت دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ بات عجیب سی لگتی ہے لیکن تاریخی مراجع کو صرف اس بنا پر جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ کوئی بات خلاف عقل ہے۔

۷۔ قدیم چینی تمدن اور جرائم کی عقوبتیں: چین کے تمدن میں سات ہزار برسوں کا تسلسل ہے اور اس کا شمار دنیا بھر کے قدیم تمدنوں میں ہوتا ہے۔ علمائے آثار قدیمہ کے خیال میں یہ تمدن ۳۵۰۰ ق م سے بھی پہلے کا ہے۔

لیکن قدیم چینی تمدن میں جرائم سخت قابل سزا (مقابل حدود) کیا تھے اس کا کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہو سکا۔[۲۴]

کیونکہ دنیا سے الگ تھلگ رہنے اور شی ہوانگ ٹی کے عہد میں تمام قدیم تحریری ریکارڈ کے تباہ و برباد ہو جانے کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے۔ قدیم زمانہ کے حالات اکثر قصوں اور کہانیوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ ہوانگ ٹی نے ۲۶۹ ق م سے ۲۵۹ ق م تک حکومت کی، اس کے بعد جس معروف چینی بادشاہ کے عہد کا پتہ چلتا ہے وہ کنفوشس ہے جس نے پانچ چنگ یا کتابیں چھوڑی جو شرعی کتابوں کے نام سے جانی جاتی ہیں۔[۲۵]

قدیم چینی تمدن میں فوجداری سزاؤں کے سخت ہونے کا پتہ چلتا ہے جس میں بال کاٹنے، کوڑے مارنے، شہر بدر کرنے اور سزائے موت تک شامل تھی۔ چوری، ڈکیتی اور شراب نوشی، فوجداری جرم تھے یا نہیں اور ان جرائم پر کس قسم کی سزائیں دی جاتی تھیں، ان کے بارے میں کوئی حتمی بات تاریخی شواہد سے ثابت نہیں۔ تاہم یہ بات طے شدہ ہے کہ زنا اور ہم جنس پرستی کا کاروبار سرکاری سرپرستی میں ہوتا تھا۔ قحبہ خانے اور بیسواؤں کے کوٹھے موجود تھے جہاں مرد اپنی جنسی بھوک مٹایا کرتے۔ اس ہم جنسی مباشرت کو جائز تصور کیا جاتا تھا۔ بیسواؤں کو اپنا دھندا چلانے کے لیے حکومت سے اجازت نامہ ملتا تھا۔ چین وجیل بیسوائیں بیرونی سفراء کو بھی

پیش کی جاتی تھیں۔ دار السلطنت میں حسین وجمیل بیسواؤں کی کافی تعداد ہوگئی تھی[۲۶]

مندرجہ بالا سطور سے یہ اندازہ لگانا ہرگز دشوار نہیں کہ قدیم ثقافتوں، تہذیبوں اور معاشروں میں جرم وسزا کی صورتِ حال کس قدر ابتر تھی، کہیں تو معمولی سے جرم پر سخت تر سزا اور کہیں شدید ترین جرائم سرکاری سرپرستی کی چھتری میں۔

ان حقائق کو جان لینے سے ایک انصاف پسند شخص خود بخود یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ افراط وتفریط سے پاک اور عدل وانصاف پر مبنی اگر کوئی تہذیب وثقافت ہو سکتی ہے تو وہ اسلامی تہذیب وثقافت ہی ہے اور عدل اجتماعی کی جو رعایت اسلام نے کی ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔

حواشی

[۱] الباشم، ہندوستان کا شاندار ماضی، ۱۶۹ [۲] نجیب آبادی اکبر شاہ خان، مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۱۲۴ (بحوالہ منوسمرتی ۸ / ۳۶۴) [۳] علی عباس، روایات تمدن قدیم، ص ۲۲۹ [۴] الباشم، ہندوستان کا شاندار ماضی، ص ۱۶۷ [۵] مناظر احسن گیلانی، ہزار سال پہلے، ص ۱۸۶ [۶] علی عباس، روایات تمدن قدیم، ص ۲۲۹ [۷] منشی پریم چند، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب، ص ۱۸۶ [۸] البیرونی، سخاؤ، ج ۲، ص ۱۶۲ [۹] البیرونی تاریخ الہند قدیم، ص ۵، ۳ [۱۰] قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص ۲۶۸ [۱۱] سراج الاسلام عہد قدیم مشرق ومغرب، ص ۲۵ [۱۲] مقبول بیگ بدخشانی، تاریخ ایران، ج ۱، ص ۱۹۰-۱۹۸ [۱۳] ساسانی سلطنت کی بنیاد ۲۲۶ء میں رکھی گئی اور یہ ایران کی آمد تک قائم تھی، ایران میں اس سے قبل پادشاہی شہنشاہیت قائم تھی۔ ساسانی سلطنت کا بانی مبانی اردشیر کو سمجھا جاتا ہے۔ اردشیر ایک عدل پسند شہنشاہ تھا، اس کے نزدیک عدل ہی سے حکومت طاقتور اور

خوش حال ہو سکتی تھی؛ اس کا ایک مقولہ عدل کے سلسلہ میں مشہور ہے۔ فوج کے بغیر کوئی طاقت نہیں ہو سکتی، پیسے کے بغیر فوج نہیں رکھی جا سکتی، زراعت کے بغیر پیسہ نہیں مل سکتا، انصاف کے بغیر زراعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ (ص ۴۶، ضیاء النبی جلد اول) (نجیب آبادی ص ۱۵۹) تیسری صدی سے چھٹی صدی عیسوی تک کا ایران مندرجہ ذیل علاقوں پر مشتمل تھا۔ افغانستان بلوچستان، سومیانہ، بلخ، عراق اور پرشیا (فارس) بعض مورخین نے مندرجہ ذیل علاقے تیسری سے چھٹی صدی عیسوی کے عرصہ میں ایرانی علاقے شمار کیے ہیں۔ بلوچستان، کیچ مکران، غوز بامیان ہندوکش، سیشان، زابلستان، خراسان، ماوراء النہر، دشت، اصفہان، مازندران، فارس، کوزستان، افغانستان، کابلستان، پنجاب، بابل، موصل اور دیار بکر وغیرہ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳، ۱۹۶۸ء) [۱۴] عبد اللہ رازی، تاریخ کامل ایران (فارسی) ص ۱۲۴ [۱۵] نجیب اکبرآبادی، اکبر شاہ خان، مقدمہ تاریخ ہند، ج ۲، ص ۱۵۹ [۱۶] آرتھر کرسٹن۔ ایران بعہد ساسانیان، ص ۳۹۹-۴۰۰ [۱۷] بریگیڈ سئیر، ہسٹری آف پرشیا (لندن ۱۹۴۹ء) ج ۱، ص ۲۴۴ [۱۸] ابن اثیر، الکامل (حیدرآباد دکن، دار الطبع جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۸ء) ج ص [۱۹] WILLDURRANT THE AGE OF FAITH(SIOMN AND SCHUSTER NEW YOUR 1954) P.149 [۲۰] پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، ج ۱، ص ۱۱۱ (بحوالہ البر نصری؛ نادر، مقدمہ کتاب الجمع بین رای الحکیمین) [۲۱] ایضاً۔ ص ۱۰۹ [۲۲] ایضاً۔ ج ۱، ص ۱۱۱ (بحوالہ السیاسۃ الشرعیہ ص ۲۱۷) [۲۳] ایضاً۔ (ایضاً۔ ص ۳۴۴) [۲۴] ایضاً (ایضاً) [۲۵] علی عباس، روایات تمدن قدیم، ص ۲۴۹ [۲۶] سراج الاسلام، عہد قدیم مشرق ومغرب، ص ۱۴۳، ۱۸۵ [۲۷] ایضاً۔ ص ۲۳۰۔

ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت

از ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی۔ علیگڑھ

(۲)

عشق اور خودی کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں ارشادِ اقبال ہے:

"... یہ درست ہے کہ خودی کا تقاضا ہے عشق، اس لیے عشق کے بغیر جیسے میک ٹیگرٹ بھی اصول کائنات قرار دیتا ہے، خودی میں استحکام پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر خودی میں استحکام پیدا کرنا مقصود ہے تو پھر اس کے فنا کا کوئی جواز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جذبۂ عشق میں جب ہم فنا پر زور دیتے ہیں تو اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ ہماری توجہ صرف اس چیز پر ہے جو عشق کا مقصود ہے... لیکن یوں کے اس عالم تصوف پر استدلال کرنا غلطی ہے جس کا مطلب ہے نفی ذات۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہماری ہستی ہمارے مقصود سے ہے۔ یہ فنا تو عین بقا ہے، صوفیا اسلام نے بھی اسی لیے فنا کو بقا سے تعبیر کیا ہے۔" (ص ۶۵-۱۶۴)

حضرت علامہ کا خیال ہے کہ تشخص ذات دراصل شعور پر مبنی و منحصر ہے:

"... لہذا شعور کا تسلسل حیات بعد الموت پر بھی قائم رہتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے قیامت کے روز کافر کہیں گے: لَوْ کَانَ لَنَا کَرَّۃً (البقرہ ۱۶۷)... تشخص ذات کا تعلق حافظے پر موقوف نہیں۔ اس کا تعلق خودی کے احساس سے ہے۔ یہ احساس یا

شعور اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے... احساس ذات کی مسلسل اور ہر لحظہ موجودگی خودی کے اسرار میں ہے۔ یہ نتیجہ ہے خودی کے استحکام کا..." (ص ۲۰۱-۲۰۲)

شاعر مشرق اور فلسفی اسلام کا ایک انتہائی محبوب موضوع "خودی" کا فلسفہ ہے جو ان کے کلام وارشادات میں جابجا اور مربوط طریقہ سے پایا جاتا ہے۔ اس پہلو ان کے ارشادات عالیہ کا دفتر تیار کیا جا چکا ہے۔ اس کے بارے میں ایک آخری ارشاد:

"... خودی تربیت یافتہ ہو یا غیر تربیت یافتہ ہر حالت میں خودی ہی رہے گی۔ اس کا جوہر ہے یکتائی۔ ہر خودی اپنی جگہ پر یکتا ہے۔ ہر خودی کا ایک تشخص اور ایک انفرادیت ہے کہ جب تک قائم ہے خودی قائم ہے ورنہ اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔" (ص ۸۳)

خودی کا تعلق شعور و حفظ ذات سے ہے۔ علامہ اقبال اس باب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "حفظ ذات کی خواہش بہر حال اتنی عام ہے جتنی انسانیت بلکہ زندگی۔ لہذا بقائے دوام کا امکان ہر شخص کے لیے موجود ہے۔ اسلام عبارت ہے فطرۃ اللہ سے۔" (ص ۸۳) "بقائے دوام ایک انعام ہے، ہمارا حق نہیں۔ ہمیں چاہیے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں۔" (ص ۱۶۱)

"دنیا کے ہر مذہب نے حیات بعد الموت کی تائید کی ہے، لیکن عجیب بات ہے عہد نامۂ عتیق اس باب میں خاموش ہے"... (ص ۹۱) حضرت علامہ نے اس تصور حیات بعد الموت کو خودی کے تصور سے مربوط کر کے ان کے تعلق، فرق اور اختلاف پر بھی بحث کی ہے۔ یہ ایک لمبی فلسفیانہ گفتگو ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی تصور خودی اور تصور حیات بعد الموت میں کوئی اختلاف نہیں ہے مگر متکلمین اسلام نے جو تصورات پیش کیے ہیں وہ اسلام سے میل نہیں کھاتے۔ حضرت علامہ کے ارشادات و ملفوظات اس موضوع پر بالخصوص اور دوسرے تصورات جیسے زمان و مکان وغیرہ پر بہت اہم اور دقیق ہیں۔

مغربی فلاسفہ اور ان کے افکار و تصورات زمان و مکان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ حضرت علامہ کے نظریہ زمان و مکان پر بھی پورے دفتر کے دفتر تیار کیے گئے ہیں۔ خود حضرت علامہ نے اس موضوع خاص پر اپنے قلم سے مستقل تصنیف بھی فرمائی تھی جو بدقسمتی سے یا تقدیر الٰہی سے ضایع ہو گئی۔ ان کے اشعار و کلام میں بھی اس موضوع پر بہت مواد ملتا ہے۔ تاہم ان کے ملفوظات میں ان کے افکار خاص کی ایک دوسری شان نظر آتی ہے۔ جس میں ان کی تنقید بھی ہے، تنقیح بھی، مختصر جملوں میں ان کی تفہیم بھی ہے اور تشریح بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی ملتی ہے۔

"یورپ کے لیے برگساں کا نظریہ شاید نیا ہو۔ عالم اسلام کے لیے زمانے کی بحث کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ اسلامی الٰہیات، حدیث، قرآن اور فلسفہ کا مطالعہ کیجیے تو میری بات کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔"

علامہ نے اسی سلسلہ میں کیمبرج میں لکھے گئے اپنے مقالہ کا ذکر بھی بہت خوبصورت اور اندوہ آگیں انداز میں کیا ہے جس سے یورپی مغربی فلاسفہ اور دانشوروں کی روشن خیالی اور پرورش لوح و قلم کا بھی سچا اندازہ ہوتا ہے۔

دہریت بھی انہیں تصورات اور گورکھ دھندوں میں سے ایک ہے جس نے ہر دور جہالت میں انسان کی فکر کو گمراہ اور اس کے زاویے کو کج کیا ہے۔ موجودہ دور میں یورپ اور اس کے زیر اثر دوسرے ممالک کے اہل فکر و نظر کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں لیکن دہریت کی کتنی انواع و اقسام ہیں اور ان کے اسباب و اثرات کیا ہیں اس پر علامہ کی نظر بہت گہری ہے۔ فرماتے ہیں:

"دہریت کی ایک نہیں کئی شکلیں ہیں، ایسے ہی اس کے الگ الگ اسباب بھی۔۔۔

ایک اہل سائنس کی دہریت ہے۔ ان کی نظر مادے اور اس کے شئون سے آگے نہیں بڑھتی ایک اہل فلسفہ کی کہ اپنے فکر کی نارسائیوں میں گم ہیں۔ ایک عام دنیادار کی۔ میک ٹیگرٹ کا معاملہ ان سب سے مختلف تھا۔ اس نے ہستی باری تعالیٰ سے انکار کیا تو اس لیے کہ اسے مسیحیت کا شخصی خدا پسند تھا نہ فلسفہ کا واجب الوجود۔ وہ دونوں سے بیزار تھا۔" (ص ۶۴-۶۶)

حضرت علامہ نے اسی طرح نیٹشے کے تصور مافوق البشر اور دوسرے فلاسفہ یورپ کے تصورات سے بھی اظہار خیال و ارشاد فرمایا ہے۔ مگر ان سب کا جمع کرنا طویل بحث کا باعث ہے۔

مفکر اسلامی اور حکیم الامت نے صرف اسلام اور یورپ کے فلسفیانہ اور مذہبی و معاشرتی افکار و تصورات سے سروکار نہیں رکھا کہ ایک سے ان کی اپنی ذاتی وابستگی تھی اور دوسرے سے علمی۔ انہوں نے اپنے ملکی فلاسفہ اور برادران وطن کے تصورات و خیالات سے بھی بحث کی ہے کہ وہ ان کے درمیان رہتے بستے تھے اور یہ بھی کہ ان کے فلسفہ و مذہب کی ملت اسلامیہ ہندیہ کی زندگی میں ایک خاص اہمیت ہے۔ ان کے ملفوظات عالیہ میں ہندو تصورات، معتقدات اور خیالات پر بہت خوبصورت جملے اور ادبی نکتے ملتے ہیں۔

تخلیق کائنات کے ایک ہندو تصور کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں"۔۔۔ لطف کی بات ہے کہ اگر قرآن کسی افسانے کا ذکر نہ کرے جب بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا اشارہ کس افسانے کی طرف ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے ہم نے کائنات کو کھیلتے ہوئے نہیں پیدا کیا۔ اس سے ہمارا ذہن خود بخود اس افسانے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ہندوؤں میں رائج ہے اور جس سے بیان کرنا مقصود ہے کہ دنیا کیا ہے؟ ایک کھیل جسے رام نے اپنی دل لگی کے لیے رچایا۔۔۔ ہندوؤں کے یہاں ایک دیوتا ہے جس کا نام ہے نٹ راجن یعنی کھلاڑیوں کا راجہ۔ وہ اس کی

مورتی بھی تیار کرتے ہیں تو اس طرح جیسے یہ دیوتا راگ رنگ میں مشغول ہے... ایسے ہی صفات باری تعالیٰ کے ذکر میں جب قرآن یہ کہتا ہے کہ لا تاخذہ سنۃ ولا نوم (البقرہ ۲۵۵) تو بے اختیار ہندوؤں کا یہ قول یاد آجاتا ہے کہ کائنات پرماتما کا خواب ہے۔ ادھر اس کی آنکھ کھلی اور ادھر یہ خواب پریشاں ہوگیا... ہمارے ہاں بعض صوفیہ نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔" (ص ۶۰-۵۹) حضرت علامہ نے ہندو تصور مایا پر بھی اسی طرح ارشاد فرمایا ہے۔ (ص ۸۶-۸۳)

مفکر اسلامی کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ تقابلی مطالعہ اور ملفوظ ارشاد کیے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ اس کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ جسم و جسد کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "خودی کے لیے شاید کوئی جسد ناگزیر ہے' یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ہمیں جسد کی بربادی کا غم نہیں ہونا چاہیے پھر یہ ضروری کیا ہے اور غیر ضروری کیا۔ یہ ارشاد بڑا معنی خیز ہے بلکہ ایک راز۔ شاہ صاحب نے بھی تو جسد بعد الموت کے لیے نسمہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ ہندو ادب میں بھی اسی طرح کا ایک لفظ موجود ہے۔" (یعنی شریر/سریر) (ص ۸۸-۸۷) حضرت علامہ نے ہندو تصورات و افکار کے علاوہ ان کی شخصیات پر بھی اپنے ملفوظات میں اظہار خیال کیا ہے، جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

ملفوظات اقبال میں سماجی اور معاشرتی موضوعات پر بھی خاصہ کے ارشادات ملتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ادبیت کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی فکر و عقیدہ سے ان کو مربوط کرتے چلے جاتے ہیں۔ حکیم الامت ہونے کے ناطے وہ اسباب' آغاز اور نتائج کا بھی تجزیہ کرتے ہیں، شادی کے مسئلہ پر ارشاد فرماتے ہیں:

"اسلام نہ کسی عورت کو کسی مرد سے نکاح کرنے پر مجبور کرتا ہے نہ روکتا ہے۔ یہ معاملہ

ان کی اپنی پسند کا ہے۔ لہذا اسلام کا فیصلہ ہے کہ ایک مسلمان عورت جس مسلمان مرد سے چاہے شادی کر سکتی ہے۔ اس نے یہ بات ہر شخص کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دی ہے جس میں ممکن ہے وہ غلطی بھی کرے... ہندوستان میں مغلوں نے راجپوت شاہزادیوں سے محض اس لیے شادیاں کیں کہ راجپوت ایک جنگجو قوم ہیں... مغل سمجھتے تھے کہ ان سے ازدواجی تعلقات قائم کیے گئے تو مغلوں کے نسلی خصائل کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔" (ص ۱۴۷)

حضرت علامہ نے اسی حقیقت کو دوسری حقیقت نسلی اختلاط اور تعصبات سے جوڑ دیا:

"نسل کا مسئلہ خاصا پریشان کن ہے، لیکن اب کون سی نسل محفوظ ہے؟ اسلام نے شادی بیاہ کے ذریعہ نسلی تعصبات کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ یوں بھی نسلیں کب سے خلط ملط ہو رہی ہیں... اب خالص نسلیت کا دعویٰ محض ایک افسانہ ہے، یہ دوسری بات ہے کہ نسلی امتیازات ابھی دیر تک قائم رہیں گے۔" (ص ۱۴۸)

خالص نسلیت سے ذاتی شرف اور خاندانی وجاہت کا نظریہ پیدا ہوتا ہے۔ حضرت علامہ نے اس پر بھی ارشاد فرمایا:

"اسلام کی نظر فرد کے ذاتی شرف پر ہے۔ حسب و نسب پر نہیں ہے۔ نسل اور رنگ کا اختلاف کوئی عیب کی بات نہیں۔ قرآن پاک نے اس کا شمار آیات الٰہیہ میں کیا ہے۔ البتہ ہمیں اس باب میں اقل ظل مزاحمت (LLIVE OF LEAST RESISTANCE) سے کام لینا چاہیے۔" (ص ۱۴۹)

اسلامی معاشرہ کے دو ادوار کے موازنہ میں یہ فصاحت و بلاغت اور حکمت ملاحظہ

"مسلمانوں کی زندگی کیسی شگفتہ تھی انہوں نے حتی الوسع اسے ہر آلائش سے پاک رکھا۔ وہ اس سے لطف اٹھانا اور اس میں حسن و جمال، طاقت و قوت کے جو لا تناہی امکانات موجود

ہیں، ان کی قدر کرنا خوب جانتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانوں کا زوال کیسا حسرتناک ہے ۔۔" (ص۲۳۲)

ان کا خیال تھا کہ اسلام ایک سیاسی اجتماعی معاشرہ ہے۔ جیسا کہ عہد نبوی و خلافتِ اسلامی میں تھا مگر بعد میں اسلام کو چند اخلاقی اور عقائدی چیزوں تک محدود کرکے اسکی اجتماعی ہیئت کو بالکل نظر انداز کردیا گیا۔ (ص۲۱۳ وغیرہ)

اسلامی معاشرہ میں ہر شخص کو بلا تفریق ذات پات ترقی کے مواقع حاصل ہیں کہ وہاں نسلی برتری کمتری کا تصور ہے نہ عمل۔ لیکن غیر اسلامی معاشروں کے اثرات کا نتیجہ ہے کہ مسلم معاشرہ بالخصوص ہندی معاشرہ میں ذات پات اونچ نیچ کی تفریق نہ صرف پیدا ہوئی بلکہ قانون فطرت بن کر رہ گئی۔ اس سے متعلق میاں محمد شفیع نے ایک واقعہ اور اس پر حضرت علامہ کا ارشاد نقل کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ گھر میں کام کرنے کے لیے جو بھنگن آتی تھی اس کا ایک ہم عمر بچہ ساتھ آتا اور ماں کی مصروفیت کے دوران جاوید منزل میں کھیلتا رہتا۔ ایک دن حضرت حکیم الامت نے ارشاد فرمایا:

"میں جب بھی اس بچے کو دیکھتا ہوں تو میرا دل اضطراب سے پارے کی طرح تڑپ اٹھتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ سماج کی زنجیروں کی وجہ سے یہ بچہ زندگی میں صرف خاکروب بن سکے گا حالانکہ اس میں اور جاوید میں جہانتک انسان ہونے کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں۔ اگر جاوید ذہانت میں اس لڑکے سے کم بھی ہو تو محض اس وجہ سے کہ وہ میرا بیٹا ہے، اس پر ترقی کے راستے کھلے رہیں گے ۔۔" (نقوش، اقبال نمبر دوم ص۴۵۶، تصانیف اقبال ص۳۹۴-۳۹۵)

حکیم الامت کو مسلم تحریکات سے خصوصی اور غیر مسلم یا دوسری تحریکات سے عمومی دلچسپی رہی تھی جس کا اظہار ان کے کلام و نثر کی طرح ان کے ملفوظات میں بھی خوب خوب ہوتا ہے۔ ہندوستان یا برصغیر پاک و ہند کی دو تحریکات سے ان کی دلچسپی بہت خصوصی نوعیت کی تھی اور ان دونوں کے بارے میں ان کے ارشادات ان کی حکیمانہ نظر، دانشورانہ فکر، اسلامی تدبر اور حقیقی تعقل کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے فکری توازن و اعتدال، انصاف و عدل اور معروضی انداز و طریق کو بھی پوری طرح اجاگر کرتے ہیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے بارے میں کیا خوبصورت تجزیہ کرتے ہیں:

"یوں جن تحریکوں کا ظہور ہوا ان میں ایک علاقہ سا قائم ہوگیا۔ حالانکہ اکثر و بیشتر ان میں باہم کوئی تعلق نہیں تھا بجز سطحی مشابہت کے۔ مثلاً یہی کہ جہاں کہیں بدعات کے خلاف کوئی آواز اٹھی اسے بھی وہابیت سے تعبیر کیا گیا۔ حتیٰ کہ حضرت سید احمد کی تحریک جہاد بھی وہابی تحریک ہی سے موسوم ہوئی ... کوئی بھی تحریک ہو اسے ناکامی اور ناکامرانی ہر طرح کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تحریک جہاد کا ایک مرحلہ وہ تھا جو بالاکوٹ میں ختم ہوا۔ دوسرا وہ جب یہ تحریک سرحد میں محدود ہوکر رہ گئی اور گو ۱۸۶۳ء کے بعد انگریزی حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیاں سست پڑ گئیں بایں ہمہ حکومت کو ان کی طرف سے کبھی اطمینان نہ ہوا۔ اس تحریک کے بچے کھچے عناصر ہندوستان میں بھی موجود تھے ..." (ص۳۲۲)

فکری تحریک ولی اللہی کے بارے میں بھی کیا خوبصورت بات کہتے ہیں:

"شاہ صاحب ہی کو دیکھئے کیسے بالغ نظر اور صاحب بصیرت انسان تھے۔ ان کی ذات جس تحریک کا سبب بنی اور یہ تحریک جہانتک بھی کامیاب ہوئی ان کی دور اندیشی اور امت کے لیے غیرت و حمیت کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے، ان کے ارشادات کی قدر و قیمت آج واضح ہو رہی ہے۔" (ص۳۲۱)

وہابی تحریک کے بارے میں فرماتے ہیں :

" وہابی تحریک ایک چنگاری تھی جس نے عالم اسلام میں ہر کہیں تقلید اور استبداد کے خلاف ایک آگ بھڑک اٹھی (بھڑکا دی) صدیوں کا جمود ٹوٹا۔ قوائے علم وعمل شل ہو رہے تھے ان میں پھر سے حرکت پیدا ہوئی۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ مغرب کے سیاسی اور معاشی تغلب کے خلاف ایک محاذ قائم ہونا چاہیے " (ص ۳۲۱-۲)

علی گڑھ تحریک کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ "... علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قوائے علم وعمل حرکت میں آئے، یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی " اس کا تعلق دیوبند تحریک سے یوں جوڑتے ہیں: " دیوبند ایک ضرورت تھی۔ اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل۔ وہ [illegible]ت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قایم ہے، یہ ضرورت پوری ہوئی ... لیکن دیوبند کو چاہیے تھا اس روش پر قائم رہتا، سیاست کے چکر میں نہ آتا ... (ص ۳۹۳)

حکیم الامت کے ملفوظات میں شخصیات کا ذکر بھی بہت دلآویز انداز اور علمی تجزیے کی صورت میں ملتا ہے۔ اس کا مرکزی نکتہ حق وصداقت کا اظہار اسلام کی کسوٹی پر افراد کی پرکھ، خوبیوں کی وسیع القلبی کے ساتھ تعریف وتوصیف، خامیوں پر شرافت کے ساتھ تنقید وتنقیح اور معروضی انداز میں اپنے فہم وفراست اور علم ویقین کے ساتھ شخصیت کی تصویر کشی ہوتی ہے، حضرت علامہ کا معیار حق وصداقت خالص اسلامی ہے اور نادر بھی۔ بعض اسلامی شخصیات کا ذکر دوسرے عناوین کے تحت پہلے آچکا ہے، اب خالص عنوان کے ساتھ ان کے بعض اوصاف وجہات کا تذکرہ انہیں کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

امام غزالی اور ان کے علمی کارنامے کو ایک ہی ساتھ کس خوبصورتی کے ساتھ اجاگر

کرتے ہیں :

" احیاء العلوم بڑی چیز ہے۔ اس کی علمی اور فلسفیانہ قدر وقیمت کا ٹھیک اندازہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ غزالی بہت بڑا انسان تھا ... احیاء کی تصنیف سے فکر انسانی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوتا ہے " تہافت " کو اس کا مقدمہ کہیے۔ وہ فکرِ انسانی کا ایک اچھوتا مظہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالی کے مقاصد مذہبی تھے، لیکن فکر کی تنقید میں انہوں نے جو منہاج وضع کیا اسکے لیے فلسفہ ہمیشہ انکا مرہون منت رہے گا۔ یہ منہاج وضع نہ ہوتا تو عقل وفکر کا قدم آگے نہ بڑھتا۔ غزالی کا مذہبی درجہ بھی بڑا بلند ہے لیکن فلسفیانہ حیثیت سے بھی ہم ان کی ذہانت وطباعی سے انکار نہیں کر سکتے ... فلسفیانہ اعتبار سے دیکھا جائے تو ڈیکارٹ کے مباحث وہی ہیں جو غزالی کے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ غزالی کے یہ مباحث کسی دوسرے ذریعے سے یعنی بالواسطہ یورپ میں پہنچے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ایک طرح سے تہافت کا سرقہ کیا ہو اسلامی افکار کے نفوذ واشاعت میں ابھی ہماری معلومات بڑی محدود ہیں " (ص ۳۰۵-۶)

امام ابن رشد سے امام غزالی کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں اماموں کی خصوصیات وامتیازات کو کس حکیمانہ اور بلیغ انداز میں واضح فرماتے ہیں:

" ابن رشد ارسطو کا شاگرد ہے۔ وہ ارسطو سے خوب واقف تھا لیکن اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔ غزالی کی شخصیت اس کے مقابلے میں بڑی عظیم ہے۔ دراصل ابن رشد کی عظمت کا راز ہے اس کی طبی اور فقہی حیثیت۔ فلسفہ میں ارسطو نے اسے ابھرنے نہیں دیا۔ گو یورپ اس سے متاثر ہوا۔ پاڈوا (اٹلی) ابن رشد کی تعلیم کا خاص مرکز تھا " (ص ۳۰۵)

جامع ملفوظات کا بیان ہے کہ:

"اٹلی اور فرانس میں ابن رشد کے اتباع میں جو فلسفیانہ تحریک پھیلی اس نے ایک حد تک مذہبی عقیدے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مسیحی کلیسا کو اس تحریک کے رد میں بڑی سر توڑ کوششیں کرنا پڑیں۔" (ص ۳۰۵ حاشیہ ۲)

امام ابن تیمیہ اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے بانیِ فن استقرار ہونے اور یورپی فلاسفہ و مفکرین پر ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"نووم آرگینان (NOVUM ORGANON) نام ہی اعتبار سے ایک نئی منطق ہے۔ لیکن مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ اس میں ابن تیمیہ اور سہروردی کی عبارتیں جوں کی توں موجود ہیں۔ مصنف نے یہ کیسے کہہ دیا کہ منہاج استقرا، یورپ کی دریافت ہے۔ استقرار اور تجربے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔" (ص ۱۱۷-۸)

ائمۂ ثلاثہ امام ابن تیمیہ، امام محمد بن عبد الوہاب نجدی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے کردار، عمل اور امتیاز کو کتنی خوبصورتی اور بلاغت کے ساتھ ایک ہی سانس میں پیش کرتے ہیں:

"محمد بن عبد الوہاب نے جو تحریک اٹھائی اس کا سلسلہ امام ابن تیمیہ تک جا پہنچتا ہے۔ رد تقلید کا قدرتی تقاضا تھا کہ مطالعۂ حدیث پر زور دیا جاتا۔ ہندوستان میں شاہ صاحب بھی توحدیث کی ضرورت پر قلم اٹھا چکے ہیں۔ البتہ اس تحریک کا سیاسی پہلو جسے عرف عام میں وہابیت کا نام دیا گیا اور جس سے نجد و حجاز میں باہم جنگ کی نوبت آئی ازحد افسوسناک ہے۔ اس سے عالم اسلام کے اتحاد و استحکام کو خاصا ضعف پہنچا۔ ... میرے نزدیک وہابیت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا عقائد میں تشدد اور ظواہر پر اصرار ہے۔ ..." (ص ۳۱۹)

شاہ ولی اللہ دہلوی کے امتیازات و اوصاف اجاگر کرتے ہوئے ان کی بعض کمزوریوں پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں اور اس میں ان کی عظمت کسی طرح حائل نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کا یہی توازن فکر و عمل ان کی نادر صفت بیان ہے:

"شاہ صاحب ہی کو دیکھئے کیسے بالغ نظر اور صاحب بصیرت انسان تھے۔ ان کی ذات جس تحریک کا سبب بنی اور یہ تحریک جہاں تک بھی کامیاب ہوئی ان کی دور اندیشی اور امت کے لیے غیرت و حمیت کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ ان کے ارشادات کی قدر و قیمت آج واضح ہو رہی ہے ... (ص ۳۲) ... شاہ صاحب کی شخصیت بڑی عظیم ہے مگر ان کی حقیقی عظمت کا اظہار حجۃ اللہ البالغہ میں ہوا۔ باقی تصنیفات بھی غنیمت ہیں لیکن تصوف میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے میں اس کا قائل نہیں۔ مثلاً افادات ہی ہیں ... کوئی خاص بات نہیں ... شاہ صاحب کے کچھ رسائل ہیں تصوف میں، غیر ضروری اور لاحاصل۔"

(ص ۳۰-۳۱ بالترتیب)

سر سید علیہ الرحمہ کے بارے میں عجیب افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ بالخصوص علی گڑھ سے وابستہ حضرات کیلئے مسیحائے قوم تھے اور ہر مرض کی دوا۔ جبکہ علمائے کرام بالخصوص تشدد و تقشف پسند لوگوں کے ہاں وہ صرف ایک گمراہ و رہزن عقل و خرد تھے۔ علامہ اقبال نے انکے کردار و شخصیت کا صحیح ادراک کیا ہے۔

"مولانا محمد قاسم کے نام سر سید کا ایک خط ہے جس میں وہ اپنے عقائد فہرست وار بیان کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ ان میں کون سی بات ہے جس کی بنا پر علمائے سہارنپور انہیں کافر ٹھہراتے ہیں ... یہاں بحث سر سید کے معتقدات سے نہیں۔ بحث اس امر سے ہے کہ اسلام اور کفر کا مابہ الامتیاز کیا ہے؟ ... علمائے سہارنپور نے یہ نہیں سوچا کہ سر سید نے

قرآن مجید کی تفسیر لکھی، تہذیب الاخلاق نکالا، علی گڑھ کالج قایم کیا یا مسائل الہیات پر قلم اٹھایا تو اس سے ان کا مدعا کیا تھا؟ یہی کہ مسلمانوں کو اپنی وحدت کا شعور رہو۔ وہ ایک قوم ہیں، لہذا بحیثیت ایک قوم انہیں... سمجھ لینا چاہیے کہ مغرب کے سیاسی معاشی استیلا یا علوم و فنون میں انکے اجتہادات اور اختراعات نے ہمارے لیے کیا مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ وہ اعتماد رکھیں کہ مغربی تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کی جو رو انگریزی تسلط کے ساتھ آگئی ہے ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیے اسلامی عقائد کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔" (ص ۸۵-۲۸۳)

حضرت اقبال کو سرسید کے سیاسی نقطۂ نظر، قومی سیاست میں موقف اور مسلم و قومی سیاسی تحریک سے اتفاق تھا جبکہ نیشنلسٹ علماء اور قوم پرست مسلمانوں کو ان سے اختلاف۔ حضرت علامہ کے ارشادات میں اس موضوع پر بہت زیادہ مواد ہے اور اسی کے ساتھ مولانا مدنی کی سیاست اور ان کے طرز فکر سے اختلاف بھی۔

مولانا حسین احمد مدنی کانگریس کے ساتھ اشتراک اور متحدہ قومی سیاست کے قائل تھے خواہ وطنی قومیت اور ہندو مسلم قومیت کے اتحاد کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ حضرت علامہ کا مولانا مرحوم سے تا زندگی اختلاف رہا جو ان کے کلام نثری تحریروں اور ملفوظات میں جا بجا موجود ملتا ہے۔ علامہ کو وطنیت کے بنائے قومیت ہونے سے اختلاف تھا اور وہ اس کے قائل تھے کہ اسلام لا وطن اور آفاقی ہے۔ جبکہ مولانا مرحوم کو اصرار تھا کہ موجودہ دور میں وطن و جغرافیہ ایک وجہ قومیت ہے۔ حضرت علامہ نے اس موضوع پر آخر دم تک ان کے خیالات کی تغلیط و تردید کی۔ فرماتے ہیں:

"مولوی حسین احمد کے اس غلط خیال کی تردید مقصود ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی

ہیں... (ص ۴۹) اسی سے متعلق ان کے تین مشہور شعر ہیں جن کے اندراج کی تاریخ ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء بروز جمعہ ہے۔" (ص ۲۶-۱۲۵)

جب ان کے گوش گذار کیا گیا کہ مولانا مدنی کے حامی فرماتے ہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ خیال نہیں ہے تو حضرت علامہ نے فرمایا:

"... ہمیں ان سے کوئی ذاتی پرخاش تو ہے نہیں۔ وہ ایک بیان شایع کر دیں اور صاف صاف فرما دیں کہ اسلام کی رو سے وطن بنائے قومیت نہیں۔ وہ ایسا کریں تو ہم ان کی جرأت ایمانی کے اعتراف میں تین کے بجائے چھ شعر کہہ دیں گے:

نہ دانی نکتۂ دین عرب را　　　　کہ گوئی صبح روشن تیرہ شب را

اگر قوم از وطن بودے محمد　　　　نہ دادے دعوت ابی لہب را

... آگے چل کر یہی وطنیت دہریت کا سبب بنی۔ مولانا حسین احمد اس سادہ سی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ تاریخ سے ناواقف ہیں۔" (ص ۶۷-۱۶۶)

حضرت علامہ کے ملفوظات میں حضرت مدنی اور ان کے قومیت کے نظریہ پر بہت سا مواد ہے جس میں شعر و شاعری کے علاوہ نثر و ملفوظ بھی بہت کچھ ہے ص ۲۳-۲۰۷ ص ۱۷۶ ص ۱۷۳ ص ۹۵-۲۶۵ وغیرہ

اسی وطنیت، قومیت اور نسلی عصبیت کے حوالے سے حضرت علامہ نے مصطفیٰ کمال پاشا ۱۸۸۱-۱۹۳۸ء کے بارے میں بھی اپنا وہی معروف تجزیہ پیش کیا ہے:

• وطنی قومیت اگرچہ اتحاد اسلامی کے خلاف سب سے بڑا خطرہ ہے۔ لیکن افسوس ہے ترک خود ہی اس تحریک کا شکار ہو گئے جو ان کے خلاف اٹھائی گئی تھی... مصطفیٰ کمال، کمال پاشا سے اتاترک بنے اور انجام کار ان کی تقلید میں ہر کہیں اسلام کی تعبیر نسلی اور وطنی

نقطۂ نظر سے ہونے لگی"۔ (ص۳۲۶)

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ ان کے ترجمان القرآن اور تفسیر کے حوالے سے الفاظ اقبال میں کیا جاچکا ہے۔ حضرت علامہ کو ان کے تفسیری نقطۂ نظر اور سیاسی موقف دونوں سے اختلاف تھا اور انہیں دونوں کے حوالے سے ملفوظات اقبال میں ارشادات حکیم الامت ملتے ہیں:

"مسلمان بڑے سادہ ہیں اس قسم کی تعبیریں قبول کر لیتے ہیں وہ نہیں سوچتے مولانا کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا یہ کہ اسلام کی اس تعبیر کے پیش نظر جو انہوں نے "الدین" اور "الاسلام" کی شکل میں کی ہے مسلمان سیاست کو مذہب سے الگ رکھیں۔ اپنے لیے جداگانہ قومیت کا مطالبہ نہ کریں۔ اس گروہ بندی میں شامل ہوجائیں جس کی بنا اشتراک وطن پر ہے اور یہ سب قطع نظر اس تصور کے جسے ہندوستانی قومیت کے نام سے ابھارا جارہا ہے اس لیے کہ ادیان اصلاً سب ایک ہیں (ص۳۰)

حضرت علامہ مولانا آزاد کے "غور و فکر میں لادین سیاست" کو کارفرما دیکھتے تھے (ص۳۰، نیز ص۳۰۲-۳۰۳) اور اسلام کے سیاسی نقطۂ نظر کے خلاف گردانتے تھے۔ یہی بنائے اختلاف و تبصرہ ہے۔ ورنہ ذاتیات پر بحث نہیں ہے[1]

اپنے ہم فکر و خیال شعراء میں وہ رومی کے معنوی شاگرد تھے اور ان سے کسب فیض کرکے گمرہی سے بچے تھے (ص۱۰۱) لیکن غالب کی عظمت کے بھی قائل تھے: "غالب واقعی بہت بڑا شاعر تھا... غالب کا کلام فارسی ہی میں ہے۔ غالب کا فارسی کلام پڑھیے اور ضرور پڑھیے۔ غالب کا

---

[1] معارف: مولانا مدنی اور مولانا آزاد کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب کے بعض خیالات غلط فہمی پر مبنی تھے جس پر متعدد اہل قلم پہلے لکھ چکے ہیں، معلوم ہوتا ہے مقالہ نگار نے ان چیزوں کو سامنے نہیں رکھا ہے، اسلیے ان کا تجزیہ یک رخا ہوگیا ہے۔

فارسی کلام بڑی چیز ہے... لیکن محض پنشن میں اضافے کے خیال سے سرکار انگلشیہ کی مدح میں قصائد لکھنا بڑے افسوس کی بات ہے۔ غالب کی اس روش سے بڑا دکھ ہوتا ہے"۔ (ص۲۷۸)

ملفوظات میں صاحب ملفوظات کی شخصیت و کردار، ان کے ترکیبی عناصر، ماضی حال اور مستقبل کی پرچھائیاں اور اوصاف و خصوصیات کے دوش بدوش کمزوریاں اور خامیاں اجاگر نہ ہوں ایسا ممکن نہیں ہے۔ حضرت علامہ کی بیماری آزاری، جسمانی کمزوری، فطری و خلقی کاہلی اور فلسفیانہ تصوراتی فضا کی جھلک بھی آجاتی ہے اور ان کے فکر و تدبر کی دنیا بھی جگ مگ کرنے لگتی ہے۔ یہ وسیع و عریض باب ہے جس کے صرف چند پہلو ہی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں انکے والد ماجد شیخ نور محمد، فرزند جاوید اقبال، ملازم علی بخش اور دوسرے ارکان خاندان کے علاوہ ان کے احباب و فیض یافتگان کی تصویریں بھی ہیں۔

حضرت حکیم الامت کے ارادۂ حج و سفر مبارک پر ایک ملفوظ ہے:

"ارادہ تو ہے بشرطیکہ صحت اجازت دے، ورنہ اب کے نہیں تو اگلے سال سہی، آگے جو اللہ کو منظور ہو... ایک طرح سے تو میں حج ہی کے راستے میں ہوں۔ چاہتا ہوں یہ راستہ جلد طے ہوجائے... یہ راستہ طے تو ہوجاتا ہے لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، میں تو اب جو کچھ کہتا ہوں وہیں کے لیے کہتا ہوں... آستانہ اقدس پر پہونچ جاؤں تو کچھ اور بھی عرض کروں"۔ (ص۳۸-۳۷)

مشہور واقعہ ہے کہ ڈاکٹر لوکس پرنسپل فارمن کرسچین کالج لاہور کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم مع الفاظ نازل ہوتا تھا، حضرت حکیم الامت نے فرمایا:

"یہ عبارت ہی اتری تھی... میرا تجربہ ہے۔ مجھ پر پورا شعر اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت

(افوار)

کیوں نہیں اتری ہوگی ... جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو یہ سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آرہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہوگیا۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں ... یہ کیفیت تو مجھ پر سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے طاری رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا چلا جاتا ہوں پھر عجیب بات ہے کہ جب طویل عرصے کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے۔ گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہوجاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان عصبی اضمحلال اور پژمردگی محسوس کرتا ہوں ... ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے، چنانچہ اس زمانے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہوگئی ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحر موج ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیت سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطل کی تلافی کر دی۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے۔

اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہوسکتی۔" (روزگار فقیر اول ص۲۲-۲۱)

آخر میں خاتمۂ کلام اسی موضوع پر جس سے آغاز ہوا تھا: "صبح سویرے میں حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا والد ماجد مسجد سے واپس آئے ... اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے: بیٹا قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو، مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہوسکتا ہے ... تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کروگے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا ... (اقبال کے حضور اول ص۶۱-۶۰)

خصوصیات | حکیم الامت علامہ اقبال کے ملفوظات کی امتیازی خصوصیات کا تعلق علم و فضل، مطالعہ و مشاہدہ، غور و فکر، ادراک و شعور اور حکمت و فلسفہ کے علاوہ ادب و تہذیب اور فصاحت و بلاغت کے بہت سے پہلوؤں سے ہے اور یہاں بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ حضرت اقبال کے ارشادات و ملفوظات کا دامن موضوعات اور دائرۂ عناوین ان کے علم و فضل کی طرح وسیع ہے۔ اس میں مختلف موضوعات سمٹ آئے ہیں۔ قرآنیات، حدیث، فقہ، قانون، کلام، فلسفہ، منطق، سماجیات، معاشیات، ادب، تہذیب غرضیکہ وہ کونسا موضوع ہے جو ان کی گرفت یا دسترس سے باہر ہے۔ تبحر علمی اور وسعت معلومات کا ایک بحر ناپیدا کنار ہے جو ہر آن ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔

۲۔ موضوعات زیر بحث اور مضامین و کلام میں وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وسیع مطالعہ گہرے مشاہدہ، ہمہ جہت شعور، غیر معمولی تدبر اور اسلامی حکمت کی بھٹی سے تپ کر نکلتا ہے

اور کندن ہوتا ہے۔ ان کا معمولی سا معمولی ملفوظہ اور عام سا عام کلمہ بھی ان کے تدبر و تفکر اور تعقل کا زائیدہ و پروردہ ہوتا ہے۔

۳۔ ان کے ملفوظات و ارشادات کی اسلامیت ان کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے جو ان کی روح و بدن کی طرح شدید اسلامی عصبیت کی پیکر تھی۔ لڑکپن میں انہوں نے قرآن کریم کا جو مطالعہ کیا تھا وہ ان کی روح کی پنہائیوں میں، ان کے رگ و پے میں، ان کے دل و دماغ میں، ان کے وجدان و قلب میں الہام ربانی کی طرح سما گیا تھا۔ بعد کے مطالعۂ اسلامی نے ان کے قلب و جگر اور فکر و نظر اور زبان و بیان کو اسلامیت کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ موضوع، مضمون، خیال، فکر اور اظہار و ابلاغ کچھ بھی ہو وہ اسلامیت کی کسوٹی پر بھی پرکھے جانے کے بعد ہی زبان و قلم پر آتا تھا۔

۴۔ خلوص ان کی ایک اور اہم صفت ہے۔ ان کی پوری زندگی اخلاص سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں دہرا معیار تھا نہ مداہنت و مسابقت کا شائبہ۔ وہ اندر باہر، روح و جسم، زبان و قلب میں یکساں تھے۔ ان کی فکر و ادراک جو انہیں باور کرا دیتی تھی اسی کو وہ حرز جاں اور حفظ زباں بنا لیتے تھے۔ قرآنی الفاظ میں وہ جو کرتے تھے وہی کہتے تھے، وہ وادیوں میں نہیں بھٹکتے تھے، گمراہوں کے امام نہ تھے بلکہ وہ ان ایمان و عمل صالح والے شاعروں اور کاتبوں میں سے تھے جو کثرت سے یاد الٰہی کرتے تھے اور مومن خالص تھے۔

۵۔ حکمت و فلسفہ ان کا خصوصی موضوع تھا مگر اس پر بھی اسلامی رنگ حاوی تھا۔ ان کے ملفوظات بھی حکیمانہ ہوتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی بدولت، ان کی پیروی کے صدقے اور ان کی شیفتگی کے طفیل میں جوامع الکلم سے

نوازا گیا تھا۔ ان کے ملفوظات میں حکمت و تعقل کا گہرا اثر نظر آتا ہے جو اسلامی حکماء کے فیضان کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے اور عطائے حکیم اول کی داد و دہش کا عطیہ بھی۔

۶۔ بایں ہمہ ان کے ہاں خاص کر ان کے ملفوظات میں ان کا انکسار علم، تواضع، فضل، اور خاکساری ذہن کا ایک نادر نمونہ نظر آتا ہے۔ اگر انہیں کسی چیز کا علم نہ ہوتا تو وہ اپنے ساتھیوں، شاگردوں اور دوسرے اصحاب علم و شرکائے مجلس سے استفسار کرنے میں جھجک نہ محسوس فرماتے تھے معلومات حاصل کرتے، ان کا تجزیہ کراتے، خود غور و فکر فرماتے اور پھر ارشادات سے ان کو آراستہ کرتے کہ یہی ہے انداز علم و فکر اور طرز اظہار و ابلاغ جو اہل علم پر سجتا ہے۔

۷۔ اقبال کے ملفوظات میں ایک دلکش، دل کشا اور دل آسا فضا ملتی ہے۔ قاری کو گھٹن کا احساس نہیں ہوتا صاحب ملفوظات ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ اپنی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کرنے یا اسے قد آدم سے زیادہ بڑا بنا کر دکھانے کی کوشش میں مصروف ہیں شخصیت سازی اور اظہار عظمت کا جذبہ کبھی کبھی تو صاحب ملفوظات میں ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر جامع ملفوظات میں "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" اور یہی شئے ہے جو فکری اور علمی گھٹن پیدا کرنے کی اہم ترین وجہ ہوتی ہے۔ طنز و ظرافت کے نمونے بھی اسی کا اظہار ہیں۔ ملفوظاتی طنز و ظرافت پر ایک کتابچہ لکھا جا سکتا ہے۔

۸۔ ملفوظات حکیم الامت میں تقشف و تشدد اور فکری و علمی عصبیت کا احساس بھی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک وسیع القلبی، وسیع المشربی اور وسیع الفکری کی فضا نظر آتی ہے، وہ تحریکات، شخصیات، افراد، طبقات، تصورات، افکار غرضکہ ہر میدان میں کھلے دل و دماغ تازہ تر ذہن اور بالیدہ ترین فکر و ظرف کا ثبوت دیتے نظر آتے ہیں۔ بسا اوقات وہ مخالف

ومنکر کے نظریات وافکار کی تعریف وتحسین بھی کرتے ہیں باوجود اس کے کہ وہ اس سے کسی طرح متفق نہ تھے۔ البتہ وہ یہ ضرور جانتے تھے کہ اس کے لیے اسلام یا کسی دوسرے اصول کا سہارا غلط انداز سے نہ لیا جائے۔

۹۔ مفکرِ اسلامی اور شاعرِ حکیم کی شخصیت اور اس کے ایک آئینہ دار ملفوظات کی غالب اہم ترین خصوصیت ان کی حق پرستی، صدق نوازی اور حقیقت پروری ہے۔ وہ سچ بات کہنے، کہلانے اور اس کا اظہار کرنے میں نہ شخصیت کے قد وقامت کو خاطر میں لاتے ہیں نہ اس کے تبحر علمی کے سحر وشہرت کو اور نہ ہی دوستی، تعلق اور ذاتی ربط کو اس میں راہ دیتے ہیں، بسا اوقات انہوں نے تمام اعتراف عظمت واقبال صلاحیت کے باوجود اپنے معاصرین اور متقدمین کی غلطیوں اور کمزوریوں کی گرفت کی ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے صرف ایک معیار تھا۔ حق جو انہیں اسلام نے سکھایا تھا اور قرآن نے سمجھایا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کیا تھا۔

۱۰۔ شرافتِ کردار کی مانند حضرت اقبال کی تحریروں، نگارشات، شعر وشاعری میں شرافتِ قلم بھی تھی اور یہی شرافت اظہار بن کر ان کی زبانِ شرافت ترجمان سے پھول بن کر جھڑتی تھی۔ ان کا اختلاف وتنقید اور اعتراض ونقد بھی شرافت، تہذیب اور تادیب کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا ہے۔ وہ کسی مخالف کی کردار کشی نہیں کرتے، کسی طبقہ کے خلاف زہر نہیں اگلتے۔ تعریف میں قصیدہ نگاری نہیں کرتے، تحسین میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملاتے کہ وہ طیش میں خوفِ خدا رکھتے ہیں اور عیش میں یادِ خدا۔

ادبی اعتبار سے ملفوظاتِ اقبال کا پایہ بہت بلند ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ سادہ اسلوب، سادہ ترزبان اور سادہ ترین بیان میں سلاست وسادگی کا ایک بہترین نمونہ

پیش کیا گیا ہے۔ کلام اقبال کی طرح شان وشوکت، جاہ وجلال اور گھن گرج والے الفاظ ہیں نہ تراکیب اور ایسا گفتگو، کلام زبانی میں ممکن بھی نہ تھا اور اگر وہ اسلوب شاعری وہاں اختیار کیا جاتا تو تصنع اور آورد ہوتا جو ہر طرح سے تنفر آمیز ہوتا۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حسن اسلوب اور جمالِ بیان سے عاری ہے۔ اس کا اسلوب سادہ ہے مگر دل نشیں ودلآویز۔

۱۲۔ لفظیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ملفوظات اقبال میں ان کے منثور تحریر کی مانند ایک بھی سوقیانہ لفظ نہیں آتا۔ وہ سادہ مگر باوقار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں تنافر تو دور کی بات ہے اس کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ تراکیب میں سادگی کے ساتھ کہیں کہیں ندرت بھی ملتی ہے۔ انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی کہ وہ ان جیسے تعلیم یافتہ شخص کے لیے تقریباً ناگزیر تھا۔

۱۳۔ ان کے ملفوظات کے جملے بالعموم چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جو گفتگو اور زبانی کلام کی ایک خصوصیت ہے۔ ان جملوں میں سادگی وبرجستگی ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فکر وتدبر کے سوتے سے بے ساختہ نکلے ہوں۔

۱۴۔ علامہ اقبال کے ملفوظات میں ایک اہم خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ وہ تشبیہات تلمیحات، استعارہ، کنایہ وغیرہ ادبی خصائص اور امتیازات کا استعمال بہت کم کرتے ہیں، کہیں کہیں تو ان کا در آنا ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر ترسیل وابلاغ ممکن نہیں ہوتا لیکن عموماً وہ براہِ راست اور بلاواسطہ انداز اور زبان میں اپنے مافی الضمیر کو بڑی خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۵۔ ارشادات اقبال میں تمام تر سادگی، سلاست اور مصنوعی آرائشگی سے خالی ہونے

کے باوجود ایک قسم کی شاعرانہ نغمگی اور شعری موسیقیت بھی پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس دماغ میں ہزاروں اشعار اور ان کے مفاہیم موجود ہوں، جس دل میں شاعرِ وطن کا نغمہ و آہنگ بسا ہوا ہو اس کی گفتگو، اس کا زبانی کلام اور اس کی بات چیت اس شاعرانہ نغمگی اور شعری موسیقیت سے کیسے محروم رہ سکتی ہے۔

مراجع

۱۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی، پاکستان لاہور سنہ ۱۹۸۱ء اول ۲۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (مرتب) ملفوظات اقبال، اقبال اکادمی، پاکستان لاہور، سنہ ۱۹۷۷ء ۳۔ فقیر سید وحید الدین، روز گار فقیر، لائن آرٹ پریس لاہور سنہ ۶۴-۱۹۶۳ء۔ اول دوم ۴۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر اقبال اور مسلک تصوف، اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور سنہ ۱۹۷۷ء ۵۔ مرزا محمد منور، میزان اقبال سنہ ۸۶/۱۹۸۲ء ایقان اقبال سنہ ۸۸/۱۹۷۷ء، برہان اقبال سنہ ۸۷-۱۹۸۲ء، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۶۔ سید نذیر نیازی مکتوبات اقبال، اقبال اکادمی، پاکستان لاہور سنہ ۷۷/۱۹۵۷ء ۷۔ رفیع الدین ہاشمی (الف) تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، اقبال اکادمی لاہور سنہ ۱۹۸۲ء (ب) خطوط اقبال، دہلی سنہ ۱۹۷۶ء

۸۔ سید مظفر حسین برنی (مرتبہ) کلیات مکاتیب اقبال، اردو اکادمی دہلی، چار جلدیں سنہ ۹۰-۱۹۸۹ء

۹۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر اقبال کا تصور زمان و مکان، مجلس ترقی ادب لاہور سنہ ۱۹۷۳ء ۱۰۔ نقوش لاہور اقبال نمبر اول دوم سنہ ۱۹۶۳ء ۱۱۔ محمود نظامی (مرتب) ملفوظات اقبال (پندرہ مضامین کا مجموعہ) لاہور سنہ ۱۹۴۹ء ۱۲۔ وقار عظیم، اقبال معاصرین کی نظر میں، مجلس ترقی ادب لاہور سنہ ۱۹۷۳ء ۱۳۔ خواجہ عبدالحمید اقبال کے چند جواہر ریزے، لاہور سنہ ۱۹۷۶ء۔

شیخ عبدالنبی شامی مدح

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب

حضرت شیخ عبدالنبی شامی گیارہویں صدی ہجری و بارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے ممتاز عابد و زاہد اور قوی النسبت بزرگ تھے۔ حضرت موصوف کا وطنی تعلق قصبہ شام چوراسی (ضلع ہوشیارپور، مشرقی پنجاب) سے تھا۔ شام کے ساتھ چوراسی (۸۴) کی نسبت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مغلوں کے زمانے میں شام کے اردگرد کے چوراسی گاؤں کا مالیہ شام میں جمع ہوتا تھا اور یہ مالیہ سرہند بھجوا دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس وقت شام سرہند شریف کی سرکار میں شامل تھا، انھوں نے وہاں ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا تھا جس کے افراد مالیہ جمع کرانے پر مامور تھے، لیکن آپ نے اپنے مسلمان استاد کے فیضِ صحبت اور اپنے فطری ذوق اور اندرونی کشش سے اسلام قبول کر لیا اور آپ کا اسلامی نام عبدالنبی رکھا گیا۔ آپ کے گھر والوں نے انہیں اسلام سے برگشتہ کرنا چاہا، لیکن آپ نے شدت سے انکار کر دیا، جس پر آپکو بہت سی تکلیفیں دی گئیں، آخر کار آپ کو گھر سے باہر نکال دیا گیا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی آپ کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

دینی علوم کی تکمیل کے بعد جناب شامی صاحب پھرتے پھراتے سلطانپور لودھی (ضلع کپورتھلہ، مشرقی پنجاب) میں وارد ہوئے اور وہاں کے پیرِ طریقت حضرت حاجی

عبداللہ کے دامنِ عقیدت سے وابستہ ہوگئے اور سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ سے منسلک ہوگئے لیکن خرقۂ خلافت اپنے پیر بھائی حضرت حاجی سید محمد طاہر عالم پوری سے حاصل کیا اور ان سے فیض پایا۔ اس اثنا میں جناب شامی صاحب نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور ولایت وطریقت کے اعلیٰ مدارج پر پہونچے۔ ان کی ولایت وجلالتِ شان پر اس زمانے کے لوگوں کا اتفاق ہے۔

شامی صاحب نے اپنی عمر کے آخری چالیس سال شام چوراسی میں بسر کیے اور اسلام کی تبلیغ واشاعت اور لوگوں کی رشد وہدایت میں مصروف رہے۔ ان کی تبلیغی مساعی سے سینکڑوں ہندو حلقۂ بگوشِ اسلام ہوئے۔ انہوں نے ایک درسگاہ اور لنگرخانہ بھی جاری کیا تھا جہاں سے عوام وخواص کھانا کھایا کرتے تھے۔ مولانا عبدالحئی رائے بریلوی نے نزہتہ الخواطر میں لکھا ہے "شامی صاحب جلیل القدر رہنمائے طریقت تھے، انہیں سالکانِ طریقت کی تعلیم وتربیت میں کمال حاصل تھا۔ اپنے مریدوں کو راہِ سلوک کی منزلیں طے کرا کے اعلیٰ مدارج پر پہونچا دیتے تھے۔ وہ طریقہ احسنیہ نقشبندیہ کے مقتصد تھے۔ کتابوں میں ان کی بہت سی کرامتیں اور کشوفات مذکور ہیں (نزہتہ الخواطر، ج ۶، ششم، ص ۱۷۰ - ۱۷۱) مطبوعہ حیدرآباد دکن)۔ ان دینی مشاغل کے علاوہ وہ خدمتِ خلق میں بھی مصروف رہا کرتے تھے۔ اور مزدوروں کے کام میں مدد دیا کرتے تھے، انہوں نے ۱۱۴۶ھ/ ۱۷۳۳ء میں انتقال کیا۔ ان کے مریدوں ومداحوں نے عربی وفارسی میں ان کے مراثی لکھے ہیں۔

شیخ عبدالنبی شامی شدید دینی مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف سے

بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے انتباہ فی سلاسل اولیاء میں شامی صاحب کے ایک مکتوب لطیف کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے فصوص الحکم کی ایک شرح لکھی ہے جو آج کل شاید ناپید ہے۔ آپ کے مکتوبات مجموعۃ الاسرار کے نام سے مشہور ہیں (ان کا اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے اور عرفان وتصوف اور الٰہیات کے مختلف مسائل سے بحث کرتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ۔ جناب شامی صاحب کا مزار مبارک آج بھی شام چوراسی میں موجود ہے اور مرجع خلائق ہے ایک ہندو بزرگ مزار کی نگرانی کرتے ہیں۔

ماخذ: (۱) شاہ ولی اللہ: الانتباہ فی سلاسل الاولیاء (۲) عبدالحئی رائے بریلوی: نزہتہ الخواطر، جلد ششم، ص ۱۷۰-۱۷۱ (۳) وجیہ الدین اشرف لکھنوی، بحر ذخار (۴) محمد فاضل الدین شاہ قادری بٹالوی، شرائف غوثیہ (۵) شاہ محمد غوث لاہوری، اسرار طریقت (۶) محمد سلیم شامی، تذکرہ تاج العارفین قطب الاقطاب حضرت شیخ عبدالنبی شامی نقشبندی۔

آنند نرائن ملا کی مجاہدانہ اردو خدمات

از

ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری۔

اردو کے ممتاز شاعر اور نثر نگار آنند نرائن ملا مظلوم اردو زبان کی حمایت میں برابر سرگرم رہے اور اس حیثیت سے انہوں نے جو کارنامے انجام دیے وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں جے پور کی آل انڈیا اردو کانفرنس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا:

" میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا ہوں کیونکہ زبان میری ذات کا آئینہ ہے میری میراث ہے، میری تاریخ ہے اور میری زندگی ہے۔"

ملا کی مادری زبان اردو تھی اور وہ ہندی نہیں جانتے تھے، اپنی اس مادری زبان کو ایک قیمتی متاع سمجھکر ہمیشہ سینے سے لگائے رہے اور اس کو اس کا جائز حق اور قانونی درجہ دینے کے لیے وہ ہمیشہ سعی بلیغ سے کام لیتے رہے۔ اپنی نثری کتاب "کچھ نثر میں بھی" کی رسم اجرا کے موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ:

" میں نے ہزاروں مقدمات کی پیروی کی ہے اور بعض بہت ہی کمزور مقدموں میں بھی مجھے فتح حاصل ہوئی ہے لیکن اردو کا مقدمہ ایسا ہے جو میری زندگی کے تمام مقدمات میں سب سے زیادہ جاندار ہے لیکن اس میں ابھی تک مجھے ناکامی ہی کا منھ دیکھنا پڑا ہے اور تاریخوں پہ تاریخیں لگتی چلی جارہی ہیں۔" (ہماری زبان: یکم فروری ۱۹۷۶ء)

ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں قائم شدہ اردو اکیڈمیاں ترقی اردو بیورو، اردو گھر اردو یونیورسٹی کے علاوہ اترپردیش بالخصوص بہار میں اردو کو جو سرکاری درجہ اور مراعات ملے وہ ملا کے خواب کی تعبیر ہی نہیں بلکہ مختلف محاذوں پر اردو کے لیے ان کی ستر سالہ غیر معمولی جد وجہد کا ثمرہ ہے۔ ۴۸ سال پہلے انہوں نے اردو سے متعلق حسب ذیل اشعار کہے تھے ؎

قطعہ ؎ یہ سانحہ جہل ونو میں جو ہوا   ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا
اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے   ملا نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

رباعی ؎ اک موت کا جشن منالیں تو چلیں   پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ تجھکو گلے لگا کر اے مٹتی ہوئی اردو   اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

ملا کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ درد، تڑپ اور کرب میں ڈوبا ہوا ہے۔

ان اشعار میں اردو کے عروج وزوال کی مکمل داستان بیان کی گئی ہے۔ مگر ملا یہ مرثیہ کہہ کر خاموش نہیں ہو گئے تھے بلکہ اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے حتی الامکان جد وجہد کرتے رہے۔ ملا کی اردو کی مجاہدانہ خدمات کی کہانی شروع سے آخر تک بے لوث اور مخلصانہ رہی۔

دراصل اردو زبان کو فروغ دینے میں دو طرح کے لوگوں کے نام ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنی شہرت ونا موری اور بعض ذاتی فائدوں کے لیے اردو تحریک سے وابستہ ہو گئے ہیں، ایسے لوگوں کی فہرست طویل ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ذاتی غرض وشہرت سے بے نیاز اردو زبان کو اپنا دین وایمان بنائے ہوئے ہیں، مخلصین کے اس گروہ میں چند ہی افراد نظر آئیں گے۔ جن میں ملا کا نام سرفہرست ہے۔

نامساعد حالات کے باوجود اردو کے لیے ان کی سرفروشانہ جدوجہد کی عکاسی ان کی مشہور نظم "مجاہد" سے ہوتی ہے جو ان کے مجموعۂ "سیاہی کی ایک بوند" میں شامل ہے اور جب بھی موضوع ان کی غزل کا جز بنتا ہے تو اس میں ایک عجیب لطافت اور دلآویزی پیدا ہوجاتی ہے ؎

اردو زبان غیر ہے شوق سے کہیے ملاؔ سے آکے لیکن نگاہیں ملائے تو

بزم ادب ہند کی ہر گل میں ہے خوشبو ملاؔ گلِ اردو کی مہک اور ہی کچھ ہے

ملاؔ بنا دیا ہے اسے بھی محاذ جنگ اک صلح کا پیام تھی اردو زباں کبھی

ملا اردو کو مقدس ماں کی طرح سمجھتے تھے۔ کوئی سپوت اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی اس کی ماں کو اس سے چھین لے یا اس کا چہرہ (رسم خط) مسخ کرنے کی کوشش کرے ؎

لب مادر نے ملاؔ لوریاں جس میں سنائی تھیں :: وہ دن آیا ہے اب اسکو بھی غیروں کی زباں سمجھو

اردو رسم خط سے متعلق جامعہ اردو کے خطبۂ صدارت کے یہ الفاظ سننے کے قابل ہیں:

"آج کچھ حلقوں میں سنجیدگی سے یہ سوال اٹھایا جارہا ہے کہ قومی یک جہتی حاصل کرنے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ اردو ہندی رسم الخط اختیار کرے۔ جو لوگ نیک نیتی سے یہ رائے دیتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ زبان اور رسم الخط کا تعلق جسم اور پوشاک کا نہیں بلکہ جسم اور کھال کا ہے جو جسم کا رنگ بھی متعین کرتی ہے اور اس کی ساخت پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ اردو رسم الخط نے اردو زبان کا اس کی تمام ارتقائی منازل میں ساتھ دیا ہے اور اب یہ دونوں اس طرح ہو چکے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جاسکتے"۔

ملا صاحب ہمیشہ حکومت کے ارباب حل وعقد کو متنبہ کرتے رہے کہ وہ ہندی میں اردو کے

جبراً جذب و انضمام کی کوشش سے باز آجائیں۔ زبان دفتروں اور اسکولوں میں نہیں بنتی یہ بازاروں اور چوراہوں پر بنتی ہے۔

سہ لسانی فارمولوں کے تحت جب حکومت نے ثانوی اسکولوں میں جنوبی ہند کی زبان کے ساتھ سنسکرت کو بھی شامل کردیا تو اس موقع پر بھی وہ خاموش نہیں رہ سکے۔ رقمطراز ہیں:

"مجھے سنسکرت سے کوئی پرخاش نہیں لیکن وہ زبان جس میں پچھلے ہزار سال سے کوئی قابل قدر کتاب نہ لکھی گئی ہو اسے زندہ زبانوں میں شمار کرنا سیاسی معجزہ تو ہوسکتا ہے لیکن لسانی حقیقت کبھی نہیں ہوسکتی۔ زندہ زبان وہ ہوتی ہے جو ہمارے ساتھ سوتی ہے ہمارے ساتھ جاگتی ہے اور ہمارے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔" (خطبۂ صدارت ریاستی سہ لسانی کنونشن، یوپی)

آنند نرائن ملا اردو کی لڑائی ہمیشہ تین محاذوں (۱) عوامی محاذ (۲) تنظیمی محاذ (۳) آئینی محاذ پر لڑتے رہے اور اسی پر سب کو عمل کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ ملا صاحب نے ان مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا ہے جو اردو کو صرف اپنی زبان سمجھتے تھے۔ دراصل زبانیں کسی کی میراث اور جاگیر نہیں ہوتیں، یہاں تک کہ عربی جو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے یا سنسکرت جو ہندوؤں کی زبان سمجھی جاتی ہے ان دونوں پر بھی ان دونوں قوموں کا کوئی اجارہ نہیں ہے۔ پس جس طرح ہندی صرف ہندوؤں کی زبان نہیں اسی طرح اردو بھی صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، ملا صاحب فرماتے ہیں کہ:

"اردو کو اس کا صحیح اور جائز مقام کیوں نہیں مل رہا ہے۔ اسلیے کہ حکومت کے فیصلے اس بات پر نہیں ہوئے کہ کیا حق ہے اور کیا ناحق، کیا جھوٹ ہے کیا سچ، کیا جائز ہے

اور کیا ناجائز، حکومت کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف یہ دیکھتی ہے کہ دباؤ
کس طرف سے زیادہ پڑ رہا ہے اس کے فیصلے مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، ہندی کا
دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اس لیے حکومت اردو کے حق کو نظر انداز کرتی ہے"۔

انجمن ترقی اردو ہند دہلی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور پارلیمانی اردو کمیٹی کے صدر فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے چیرمین اور ترقی اردو بورڈ بھارت سرکار کے نائب صدر، ساہتیہ اکادمی دلی کی مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے بھی انھوں نے اردو کی مخلصانہ خدمت انجام دی ہے، وہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود مرتے دم تک اردو کے کاز کو آگے بڑھاتے رہے، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے اعلیٰ افسروں اور سربراہوں سے مل کر وہ اردو کے مسائل حل کرنے کی فکر کرتے اور اسے دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں بھی بہت سے محضر نامے پیش کیے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی۔ اردو کے جن اداروں اور انجمنوں سے وہ وابستہ رہے ان کے جلسوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بنیادی مسائل کی جانب توجہ مبذول کرنے پر زیادہ زور دیتے اور اگر وہ ان اداروں اور اکادمیوں کی کوتاہیاں دیکھتے تو رضا کارانہ طور پر ان سے مستعفی ہو جاتے۔

آنند نرائن ملا آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو تحریک کے ان قافلہ سالاروں میں تھے جنھوں نے بڑے پرآشوب اور نازک حالات میں اسے پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے حقوق کی بازیابی کی منزل کی طرف گامزن رکھا۔ تشدد اور خوف کی فضاؤں میں بھی اردو کے پرچم کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ انھوں نے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جس میں تشدد کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ ملا کی پوری زندگی شعر و ادب اور اردو کی خدمت میں گزری، وہ ایک شاعر کے ساتھ اردو کے ایک عظیم مجاہد بھی تھے۔

کی مصلحت وقت سے اس نے نہ کبھی صلح
ملا کے سے دو چار ہی دیوانے ملیں گے

اخبار علمیہ

ملکہ سبا کا عہد حکمرانی تقریباً تین ہزار سال قدیم ہے، تورات، انجیل اور قرآن مجید میں ان کے ذکر کی وجہ سے ان کی شخصیت میں مورخوں اور ماہرین آثار و حفریات کیلئے خاص کشش ہے، لیکن اب جنوب عرب کے دو ملکوں یعنی یمن اور حبشہ کے درمیان یہ پرانا تنازعہ پھر شروع ہوا ہے کہ ملکہ سبا کا تعلق کس کی سرزمین سے ہے؟ گذشتہ دنوں کلکتہ کے اخبار اسٹیٹسمین میں میکائیل بنیان اور فلپ ہوورڈ کی تحریروں سے معلوم ہوا کہ اب اس تنازعہ میں شدت آرہی ہے، حبشہ کے سابق بادشاہ ہیل سلاسی کا اصرار تھا کہ ملکہ سبا ان کے خاندان کی مورث اعلیٰ ہیں، ان کا وطن حبشہ کا ایک شہر اکسوم ہے اور وہ اس ملک میں ماکیدہ کے نام سے معروف ہیں، اب یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ یہ روایت یوسیفوس کے زمانہ سے قرون وسطیٰ تک یورپ میں مسلم رہی ہے کہ ملکہ افریقی نژاد تھی، تائید میں بعض ان قدیم تصاویر کو بھی پیش کیا جاتا ہے جن میں ملکہ ایک افریقی غلام کے ہمراہ نظر آتی ہے، یہ روایت بھی دلیل میں پیش کی جاتی ہے کہ ملکہ کا پیر ناقص اور عیب دار تھا جس کو وہ ہمیشہ اپنے لمبے گاؤن میں چھپائے رکھتی تھی، حضرت سلیمانؑ بھی اس کے بارے میں اس قدر متجسس تھے کہ ملکہ کی آمد پر انھوں نے خاص طور پر ایسا بلورین فرش بنوایا کہ ملکہ نے اسے آب جو سمجھ کر پائنچے اٹھا کر اس پر قدم رکھا اور تب یہ راز کھلا کہ اس کے پاؤں پر بال تھے۔ لیکن یمن والوں کا

دعویٰ ہے کہ ملکہ جب حضرت سلیمانؑ سے ملنے یروشلم گئی تو اس نے سونے اور جواہرات کے ایسے خزانے پیش کیے جن کے لیے یمن اپنے تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے مشہور تھا، لندن میں یمن کے سفیر ڈاکٹر حسین العامری نے کہا ملکہ بالیقین یمنی ہے گو اساطیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یروشلم سے یمن واپس ہوتے ہوئے سرزمین حبشہ سے گزری تھی، انہوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کے شعبۂ تاریخ عرب کے اساتذہ سے اس موضوع پر مزید تحقیق کی فرمائش کی، ماضی میں پروفیسر فیڈری بیٹسن اور پروفیسر باب سرجنٹ نے یمنی کتبات کی تحقیق میں عمریں کھپا دی تھیں، ۱۹۵۲ء میں امریکہ کے ایک ماہر حفریات وینڈل فلیس نے مارب میں سبا کے معبد قمر کی تلاش بھی شروع کی تھی، لیکن بعد میں یمن جب کمیونسٹ حکمرانوں کے عہد میں بدامنی اور خانہ جنگی میں مبتلا ہوا تو ان تحقیقات پر بھی پابندی عائد کر دی گئی، اب موجودہ حکومت نے پھر محققین کو دعوت دی ہے اسلیے یہ ماہرین اب جوق در جوق وہاں پہونچ رہے ہیں، حبشہ میں اکسوم میں بھی ماہرین کو ایسے آثار اور ہڈیاں ملی ہیں جن کو ملکہ سبا کے باقیات کا نام دیا جارہا ہے، ادھر یمن کے تمام قابل سیاحت مقامات اور وہاں کے دارالحکومت کے سب سے بڑے ہوٹل کا نام ملکۂ سبا سے موسوم کیے گئے ہیں، یمنی محققین کے دعوے اور تحقیقات کی بنیاد قرآن مجید کے بیانات ہیں، البتہ اسٹیٹسمین کی تحریروں میں قرآن مجید کے حوالہ سے ملکہ سبا کا نام بلقیس بتایا گیا ہے جو صحیح نہیں، قرآن مجید میں نام کی وضاحت نہیں ہے کاش مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب ارض القرآن کی تحقیقات ان جدید محققوں کے پیش نظر رہتیں جنھوں نے اس صدی کے اوائل میں ثابت کیا تھا کہ ملکہ کا افریقی نژاد ہونا قطعی غلط ہے اور مشرق جنوب یا حبشہ کے دعویٰ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ

سبا کے مقامات تھے تاہم اصل مرکز کے لحاظ سے وہ یمن ہی کی کہی جائے گی۔

قرآن مجید کی صداقت اور اس کے تاریخی بیانات کی روشنی ہر دور کے صاحب فکر وتدبر اور اولی الالباب کے لیے منارۂ نور ہے، شکر ہے کہ اس کتاب مبین سے مسلمانوں کے خاص تعلق اور شغف کی خبریں مسلسل آتی رہتی ہیں، لندن کے معاصر رسالہ امپکٹ سے معلوم ہوا کہ گذشتہ دنوں ملیشیا کے کارگذار وزیر اعظم انور ابراہیم نے مالے رسم الخط اور نقش ونگار سے مزین قرآن مجید کی کتابت و طباعت کا افتتاح خود بسم اللہ لکھ کر کیا، امید ہے تین سال میں یہ شاندار مصحف مطبوع ہوگا، اس سے پہلے انڈونیشیا کے پچاس سالہ جشن آزادی کے موقع پر وہاں کے صدر سوہارتو نے ۱۹۹۱ء میں قرآن مجید کے ایک خاص نسخہ مصحف استقلال کی کتابت و طباعت کا افتتاح کیا تھا جو ۱۹۹۵ء میں اس شان سے مکمل ہوا کہ اب اسے دنیا کے سب سے بڑے مصحف ہونے کا اعزاز حاصل ہے، اس کی کتابت کی سعادت انڈونیشیا کے ایک عالم خطاط کیائی حاجی [illegible] کے حصہ میں آئی، یہ مصحف استقلال کی برکت تھی کہ اس کی تکمیل کے دو سال بعد اب وہاں بیت القرآن اور میوزیم استقلال کی شکل میں دو نہایت عظیم الشان قرآنی ادارے بھی وجود میں آگئے اور درست کہا گیا کہ میوزیم استقلال اگر ماضی کی عظمتوں کا امین ہے تو بیت القرآن مستقبل کی شوکت و سطوت کا حامل ہے، امپیکٹ لندن نے ان دونوں کے متعلق ایک مفصل روداد شایع کی ہے، آیندہ اس کا ذکر کیا جائے گا، ہم ان دونوں حکومتوں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اسی توقع پر آمین کہتے ہیں جس کا اظہار رسالہ مذکور نے کیا ہے کہ قرآن مجید کی یہ فنی خدمات قابل قدر اور ہر مسلمان کے لیے باعث افتخار ہیں لیکن حکومت وسلطنت کے امور میں بھی ہمارے حکمرانوں کے لیے یہی مصحف کامل

ان کا سرمایہ ہدایت ہونا چاہیے۔

استقلال اور آزادی کا پچاس سالہ جشن ہندوستان میں بھی بپا ہے، نصف صدی کے ہندوستان کی تصویر میں بدعنوانی، غیر ذمہ داری، حق تلفی اور ہوس مال وزر کے داغ اس کثرت سے ہیں کہ یہی اصل خد وخال بن کے نمایاں ہیں، حکومت اور انتظامیہ کی ہر سطح عیب دار نظر آتی ہے، گذشتہ دنوں اس میں ایک اور اضافہ کا علم ہوا جس کو عہد رواں کے بدترین علمی فضیحتے سے تعبیر کیا گیا، انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ (ICHR) مرکزی حکومت کا اہم ادارہ ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ خاص تاریخی تحقیق کی غرض سے قائم کیا گیا ہے، اگست ۱۹۷۳ء میں اس نے "آزادی کی جانب" نامی ایک منصوبہ تیار کیا، مقصد یہ تھا کہ تحریک آزادی کے آخری دہے کی مکمل تاریخ دس جلدوں میں مرتب کی جائے، برطانوی حکومت نے بھی یہی کام کیا تھا اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات کو مرتب کرکے ان کو تبدیل اقتدار کے طور پر پیش کیا تھا یعنی بجائے جدوجہد آزادی کے یہ محض انتظامیہ اور اقتدار کی ہموار اور سہل منتقلی تھی، اس کے جواب میں حکومت ہند کی خواہش تھی کہ ان واقعات کو تحریک آزادی کے پس منظر میں پیش کیا جائے، یہ منصوبہ پانچ سال کی مدت کا تھا اور اس میں ایس گوپال، بشیر الحسن بپن چندر، رونڈ کمار، سمیت سارکر، پارتھا سارتھی گپتا اور کے، این پانیکر جیسے مشہور مورخوں کے نام شامل تھے، لیکن پانچ سال گذر جانے کے بعد جب نتیجہ صفر رہا تو متعدد توسیعات کی گئیں، بالآخر مارچ ۱۹۹۲ء میں اس منصوبہ کی مالی امداد روک دی گئی لیکن اس وقت تک دو کروڑ روپے خرچ کیے جا چکے تھے اور عوض میں صرف ایک جلد شایع ہوسکی تھی وہ بھی اس درجہ ناقص، ژولیدہ اور کج مج تھی کہ اس کو بیکار قرار دینا

پڑا، اب الزامات اور ان کی صفائی کا سلسلہ قائم ہے، ادارہ نے شکوہ کیا کہ اس منصوبہ کو ذاتی علمی مشاغل کے لیے استعمال کیا گیا، مواد کی فراہمی کے لیے برطانیہ کے دورے کیے گیے، حالانکہ منصوبہ کے مطابق صرف ہندوستانی مآخذ کی ضرورت تھی اور یہ ہندوستان میں دستیاب تھے، ایک الزام یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے جس مواد کو پیش کیا ہے ان کا زیادہ حصہ خود ان کی دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے، بعض محققین جو عارضی طور پر تھے اور جن کی کارکردگی نہایت ناقص تھی ان کو مستقل اسٹاف کی حیثیت دی گئی اور ستم یہ کہ ان کو پروانۂ ترقی بھی عطا کردیا گیا۔ اب یہ ادارہ اپنی آبرو بچانے کے لیے کوشاں ہے اور چاہتا ہے کہ کم از کم چند علامتی قسم کی جلدیں ہی اس سال شایع ہوجائیں لیکن ٹائمز آف انڈیا کے مطابق اس قسم کا ایک وعدہ ۱۹۹۲ء میں اس وقت کے صدر نشین پروفیسر عرفان حبیب نے بھی کیا تھا جو شرمندۂ تکمیل ہی رہا اور اب موجودہ صدر نشین S.SETTAR نے بھی وعدہ کیا ہے کہ سال کے آخر تک کم از کم پانچ جلدوں کے چھپنے کی توقع ہے، لیکن خود ادارہ کے بعض ذمہ دار اس خوش فہمی سے متفق نہیں، ایک نے کہا کہ اس سے بحث نہیں کہ کیا پک رہا ہے، سوال یہ ہے کہ دسترخوان پر کیا پیش کیا جاتا ہے؟

گذشتہ جولائی میں ایک امریکی خلائی گاڑی جمعہ کے روز مریخ کی سطح پر جا اتری تین سو دس ملین میل کا یہ ناقابل تصور سفر کامیابی سے ہمکنار ہوا تو سائنسدانوں کی خوشی بھی ہمدوش ثریا بن گئی کسی نے کہا افسانہ آج حقیقت بن گیا، کسی نے اپنی خوشی اور جشن کو پہلا بین السیاراتی جشن قرار دیا، گذشتہ ربع صدی سے مریخ پر کمندیں ڈالنے کا سلسلہ جاری تھا اور غیظ و غضب کی خصوصیات اور سرخ سیارہ سے معروف یہ ستارہ

کسی ارضی پیام کو قبول کرنے سے انکار کرتا رہا، تقریباً بیس مشن روانہ کیے گئے، بعض جیسے مارس آبزرور بالکل ناکام رہے، بعضوں نے کچھ اشارے تو کیے لیکن مبہم ہے، گذشتہ دسمبر سے پاتھ فائنڈر نامی خلائی گاڑی کی تیاری زور و شور سے جاری تھی، یہ گاڑی دراصل ان دس خلائی جہازوں کا پہلا حصہ ہے جو آیندہ دس برسوں میں مریخ کے لیے تیار کیے جارہے ہیں، پاتھ فائنڈر راہ پا ہوا اور اس کے روبوٹ نے جس کا نام جہانیاں جہاں گشت رکھا گیا تھا، اپنے متحرک کیمرہ کی مدد سے تصویریں بھیجنا شروع کیں، پاتھ فائنڈر اس مقصد سے بھیجا گیا تھا کہ سطح مریخ کی ارضیاتی ساخت کا تجزیہ کیا جائے، لیکن حسن اتفاق سے اس کے روبوٹ نے جو واضح اور صاف تصویریں بھیجیں ان سے معلوم ہوا کہ گاڑی کے آس پاس چٹانیں بکھری ہوئی ہیں، یہ گاڑی ایک محدود دائرہ میں ان چٹانوں کے درمیان چلتی پھرتی رہتی ہے، اس کی بیٹری شمسی توانائی سے چلتی ہے، چنانچہ دن میں یہ متحرک رہتی ہے لیکن رات میں کمپیوٹر چلانے، موسم کی تفصیلات اور تصویریں حاصل کرنے میں بھی یہ بیٹری خاصی خرچ ہوجاتی ہے، اب سائنسداں اس بیٹری کو زیادہ دیر تک قابل استعمال بنانے میں مصروف ہیں، بہرحال اب تک جو تصویریں آئی ہیں ان میں فضا کے گرد و غبار، مریخ سے نظر آنے والے ستاروں، مریخ کے چاند فوبوس اور طلوع و غروب آفتاب کے منظر بھی شامل ہیں، مریخی چٹانوں کا رنگ سرخ سفید اور نیلا ہے، سفید رنگ عموماً چٹانوں کے بالائی حصہ میں ہے، قیاس ہے کہ یہ ایک ٹھوس معدنی شئے CALICH ہے کیلشیم اور کاربونیٹ کا یہ حجری معدن اریزونا کے علاقہ میں عام ہے لیکن اصل توجہ سرخ اور نیلے رنگوں پر مبذول ہے، ان دونوں میں واضح فرق ہے، پروفیسر اسمتھ کا کہنا ہے کہ نیلا رنگ ان چٹانوں کے مشرقی سمت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی تیز و تند طوفانوں سے چھل کر صاف ہوا لیکن جس حصہ کو

طوفانی ہواؤں نے براہ راست متاثر نہیں کیا وہ سرخ ہی ہے اور یہی مریخ کا اصل رنگ ہے، ان طوفانوں کے متعلق گمان ہے کہ یہ کسی عظیم ترین شکل میں تھا یا پھر یہ بتدریج لاکھوں کروروں سال مسلسل چلتی رہنے والی ہوا بھی ہوسکتی ہے مریخ کی زمین کے متعلق اب تصاویر کی مدد سے بتایا گیا کہ یہ تین طرح کی ہے، ایک تو پسی ہوئی ساحلی ریت کی طرح ہے دوسری کچی اینٹ کے مانند ٹھوس اور تہہ در تہہ ہے اور تیسری سفوف اور گرد جیسی ہے، سطح پر جابجا جوہڑ کے باقیات نظر آتے ہیں، جہاں شاید اربوں سال پہلے پانی بخارات میں تحلیل ہوکر غائب ہوگیا، یہ استخوان خشک کی طرح ہے، ایسی خشکی کرۂ ارض پر کہیں نہیں، تصویروں میں مریخ کے آسمان پر بھی بادل ہیں، ممکن ہے یہ پانی سے بنے ہوں، مریخ کی صبح کی تصویروں میں آسمان پر ہلکے نیلگوں رنگ بھی ظاہر ہیں، اسمتھ کے خیال میں یہ پانی کے ابخرے ہیں لیکن جوں جوں دن چڑھتا ہے یہ بادل جل کر غائب ہوجاتے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ مریخ میں طلوع و غروب آفتاب کا عمل زمین کے مقابلہ میں دیر تک اور زیادہ روشن رہتا ہے اور یہ فضا میں غبار کی نسبت سے ہے۔

مریخ پر پاتھ فائنڈر کے کامیاب نزول سے مریخ کے متعلق افسانوی ادب کے مشہور عالم اہل قلم آرتھر سی کلارک کو خوشی ہے کہ انھوں نے بہت پہلے مریخ کو اہل دنیا کی نوآبادی بنانے کا خیال پیش کیا تھا اور اب مریخ پر تلاش حیات کی سمت میں یہ بڑی پیش قدمی ہے لیکن اخبار پانیر کے ایک مراسلہ نگار کو ان جدید معلومات سے زیادہ حیرت نہیں ہوئی، انھوں نے لکھا کہ قدیم ہندوستان ان معلومات سے باخبر تھا، انھوں نے ہندوؤں کی روزانہ پوجا میں شامل مندرجہ ذیل اشلوک کا ذکر کیا۔

ادم برہما مراری استری پرنکاری/ بھانو ششی بھومی سوتو بدھا سچا/ گرہ وسچا شکرہ شنی راہو کیتو/ کروانت سروے ماما سپر بھاتم اس اشلوک میں صرف منگل یعنی مریخ کو بھومی سوتو یعنی فرزند زمین سے تعبیر کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ مریخ کو زمین سے خاص تعلق اور مناسبت ہے۔

ع۔ص۔

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

ناظم منزل، ۴/۲۸۶ امیر نشان روڈ

علی گڑھ

۴/اگست ۱۹۹۷ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

میں المجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیہ کے موتمر یازدہم میں شرکت کیلئے عمان/اردن گیا ہوا تھا۔ واپسی میں ڈاک میں معارف (جولائی) رکھا ہوا ملا۔ اس طرف چھ مہینوں سے ڈاک گھر والے مہربان رہے اور معارف برابر ملتا رہا۔ خدا کرے یہ حسن انتظام قائم رہے اور مجھے آپ کو خط لکھ کر رسالہ دوبارہ بھیجنے کی درخواست نہ کرنی پڑے۔

شذرات اس ماہ کا بھی بہت متوازن ہے اور آپ نے ایک ضروری اور اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ شاید آپ کی بات لکھنؤ کے مشاہیر کے دل میں اتر جائے۔ پروفیسر ریاض الرحمن شروانی کا علامہ شبلی نعمانی پر مقالہ بہت جامع و مانع ہے اور علامہ کی شخصیت پر انہوں نے بہت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی صاحب کی اسلامیات پر بہت گہری نظر ہے۔ ایک مشہور پاکستانی عالم کے رد میں جو مضامین انہوں نے سپرد قلم کیے تھے وہ میری نظر سے گزرے ہیں اور انہیں پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ پھر جولائی ۱۹۹۱ء میں اردن میں ان سے ملاقات ہوئی جہاں المجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیہ کے موتمر

ہشتم میں جس کا موضوع تھا "مشارکۃ الشعور الاسلامیۃ فی بناء الحضارۃ الاسلامیۃ" شرکت کے لیے ہندوستان سے میں اور پاکستان سے جسٹس جاوید اقبال اور سید رضوان علی صاحب گئے ہوئے تھے۔ رضوان صاحب نے پہلے دن پہلی نشست میں "التراث الحضاری الاسلامی فی اللغۃ الاردیۃ" کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ پڑھا تھا، میں اسے سن نہیں سکا اس لیے کہ میرا جہاز کچھ تاخیر سے عمان پہنچا تھا لیکن بعد کو مضامین کے ضخیم مجموعے "کتاب المؤتمر العالم الثامن" (عمان ۱۹۹۲ء) میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے تعلیقات کے ساتھ چھپا۔ اسی مجموعے میں میری تحریر "مشارکۃ اللغۃ الاردیۃ فی الحضارۃ الاسلامیۃ" بھی شایع ہوئی ہے۔

اس موتمر میں مشارکۃ اللغۃ العربیۃ فی الحضارۃ الاسلامیۃ پر پروفیسر احسان عباس (عمان) فارسی زبان کی خدمات پر میر مہدی محقق (تہران) ترکی زبان پر پروفیسر اکمل الدین احسان اوغلو (استنبول) ملائی زبان پر پروفیسر عبدالروف (ملیشیا) پروفیسر عبدالحمید عثمان (کوالالمپور) لطفی زہدی (عمان) اور عبدالعزیز بن جنید (پرونائی) اور بنگالی زبان پر پروفیسر ابوالحسن صادق (ملیشیا) اور استاذ شاہجہاں محمد عبدالقیوم (بنگلہ دیش) نے مقالات پڑھے تھے۔

اس موتمر کی ایک دلچسپ بات میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ نام "مختار" بہت عام نہیں ہے۔ ہندوستان پاکستان میں اس نام کے دو ایک صاحبوں ہی سے واقف ہوں، اس کانفرنس میں مختار نام کے چار چار اصحاب موجود تھے، السید احمد مختار امبو رباط (المملکۃ المغربیہ) سے تشریف لائے تھے۔ پروفیسر محمد المختار ولد اباہ جامعۂ اسلامیہ نیامی کے وائس چانسلر موریتانیہ سے آئے تھے اور میں مختار الدین احمد ہندوستان سے۔

ایک اور صاحب مغرب کے تھے ان کا نام یاد نہیں آتا۔

ڈاکٹر سید رضوان علی صاحب کچھ دنوں کے بعد ہندوستان آئے تو علی گڑھ بھی آئے جہاں ان کے کچھ اعزہ اور ندوہ کے ہم سبق اور رفقاء موجود تھے۔ کئی دن ان سے ملاقات رہی۔ وہ کراچی سے ایک علمی و دینی رسالہ بھی شایع کرتے تھے معلوم نہیں اب بھی شایع ہوتا ہے یا نہیں۔ کراچی میں ان کا کتب خانہ قابل دید ہے جس میں اسلامی تاریخ پر بہت قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔

معارف کے تازہ شمارے میں عزیزی سید محمد فاروق بخاری کی رحلت کی خبر دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ وفیات میں ان پر ایک شذرہ لکھ دیا۔ یہ کشمیر کے ایک دینی و علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ صالح نوجوان تھے اور علم و ادب کا بہت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ام اے (عربی) میں وہ میرے شاگرد ہوئے، پھر میری نگرانی میں تین سال تک وہ ریسرچ کرتے رہے۔ کشمیر کی مناسبت سے میں نے انہیں علامہ انور شاہ کشمیری موضوع دیا تھا۔ انہوں نے محنت سے کام کیا اور اس مواد کو بھی استعمال کیا جو کشمیر کے کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں محفوظ تھے۔ پروفیسر سید رفیع الدین صاحب ناگپور یونیورسٹی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور ان کے ممتحنین میں تھے۔ مولانائے اکبر آبادی شاہ صاحب کے خاص تلامذہ میں تھے، انہوں نے بھی مقالے کی بہت تعریف کی۔ یہ کتابی شکل میں شایع ہوگیا ہے۔

سید محمد فاروق بخاری دیندار و نیک نفس تھے اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے اساتذہ کا احترام ہی نہیں ان سے محبت بھی کرتے تھے۔ پروفیسر رئیس احمد کی کشمیر میں وائس چانسلر شپ کے زمانے میں میں وہاں کی اکیڈمک کونسل کا ممبر

تھا۔ پھر ریاض الرحمن شروانی صاحب جب کشمیر کے شعبۂ عربی و اسلامیات کے صدر تھے تو ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم اور میں اس شعبے کے بورڈ آف اسٹڈیز کے جلسوں میں شرکت کے لیے جایا کرتا تھا اور کبھی کبھی کئی کئی دن یونیورسٹی میں قیام کرتا تھا۔ فاروق بخاری کو جب بھی اطلاع ملتی تو شہر سے ملنے آتے اور دیر تک بیٹھتے۔ ان صفات کے ساتھ ان میں استغنا کا بھی وصف موجود تھا۔ ایک بار انہوں نے امر سنگھ کالج سرینگر سے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں آنے کا ارادہ کیا لیکن جب دیکھا کہ وہاں کچھ امیدوار پہلے سے موجود ہیں تو پھر انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی اور آخر حیات تک وہ امر سنگھ کالج ہی میں رہے اور عربی کو فروغ دیتے رہے، خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان پر رحمت کے پھول برسائے۔

والسلام : مختار الدین احمد

مکتوب دہلی

محترمی اصلاحی صاحب! تسلیم

جون ۹۷ء کے معارف میں "کہف" سے متعلق راقم کی جو تحریر شایع ہوئی تھی اس کے سلسلے میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کا یہ فرمانا بجا ہے کہ "کلاسیکل عربی زبان میں حرفِ واؤ کو ف میں بدلنے کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ یہ یوروپی اثر کا نتیجہ ہے"۔

تاہم مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن مجید میں الفاظ تھوم کی ثوم[1] اور وصل کی بصل کی صورت اختیار کرنے کی مثالیں ضرور موجود ہیں۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں ضلع ملتان جو آج کل پاکستان میں ہے وہاں پیاز کو ملتانی لوگ اب بھی "وصل" کہتے ہیں، غالباً یہ دونوں چیزیں صرف ہندوستان میں ہوتی ہیں اور عرب میں نہیں پیدا ہوتیں۔ "تھ" کو "ث" اور واؤ کے "با" میں بدل جانے کی مثال تو صحیفۂ پاک میں موجود ہے۔

گوردیال سنگھ مجذوب

[1] معارف: قرآن مجید میں ثوم کا لفظ ہی نہیں آیا ہے۔ احادیث میں ملتا ہے۔

ادبیات

شب چراغ

از

جناب عرفی آفاقی۔ لکھنؤ

طلوعِ صبحِ محشر خاوراں کو شام تھی یعنی[1]
دمک خورشید قشقے سے اٹھی مغرب[2] کی پیشانی

افق ایسا، شفق ایسی، فلک ایسا، دھنک ایسی
یہ دشت و در، یہ طشتِ زر، یہ یخ منظر درخشانی

اس اوج و موج رنگ و نور میں انوار پیشیں کیا
غبارِ کاروانِ رفتہ کی کم کم ضو افشانی

علوم تجربی کا شوق دل میں کس[3] نے اکسایا
کیا کس نے تعقل[4] کا رواں ٹھہرا ہوا پانی

وہ کیا موجِ نظر تھی جس سے ہے زیر و زبر دریا
سفینہ کس ہوائے ناز سے ہے ایسا طوفانی

---

[1] قیامت کے روز آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا (حدیث) [2] صوتی قافیہ [3] اسلامی مشرق میں زوالِ علم کی انتہا مغرب میں نئے نئے علمی اکتشافات و انکشافات کا نقطۂ آغاز تھا [4] اشارہ ہے پیغمبر اسلام صلعم کی ذات گرامی کی طرف [5] عقل استقرائی مراد ہے۔

ملے موقع تو پڑھ قرآں بصیرت کی نگاہوں سے
جو فرصت ہو تو کر تاریخ کی اوراق گردانی

ظن و تخمیں سراسر دانشِ چیں، بینشِ ایراں
گمان و وہم یکسر حکمتِ ہندی و یونانی

کہاں علم[1] الحقائق اور کہاں افسانہ و افسوں
کہاں موجیں سرابوں کی، کہاں دریا کی طغیانی

نثار اس علمِ محکم کے، فدا اس اسمِ اعظم کے
کہ جس کے زور سے ٹوٹا طلسم جہل و نادانی

رخِ فطرت سے پردہ لحظہ لحظہ اٹھتا جاتا ہے
کہ رفتہ رفتہ کھلتے جاتے ہیں اسرارِ نہانی

سمجھ میں آتے جاتے ہیں رموزِ عَلَّمَ الْاَسْمَاء[2]
ہوئے جاتے ہیں روشن آیۂ تسخیر کے معنی[3]

بھرم ٹوٹا خداوندانِ باطل کی خدائی کا
کہ عظمت آپ اپنی حضرتِ انساں نے پہچانی

مگر یہ علم، یہ حکمت، مگر یہ دانش و بینش
یہی، جی ہاں یہی قندیلِ محرابِ خوش امکانی

چراغِ راہ اگر ایماں نہ ہو اس دشتِ ظلمت میں
کرے چشمک بہ رنگِ دیدۂ غولِ بیابانی

---

[1] علوم طبیعی مراد ہیں [2] وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (آیۂ شریفہ) [3] صوتی قافیہ۔

حقیقت ایک آتی ہے نظر دو جیسے احول کو
دوتا کرتی ہے یکتا کو خرد کی نامسلمانی

دوئی کیا؟ جسم کی اور جان کی آپس میں ٹھن جانا
دوئی کیا؟ دیدہ و دل کی بہم دست و گریبانی

دوئی کیا؟ دین کا دنیا کے ہنگاموں سے کٹ جانا
دوئی کیا معبد و یزداں، دوئی کیا؟ ملک و شیطانی

کسی کو کسب کا ہوکا، کسی کو ترک کا سودا
ہوا کا کوئی زنجیری، خلا کا کوئی زندانی

کوئی لہلوٹ صورت پر، کوئی معنی کا دلدادہ
بفیضِ جہل ہر ناداں کو دعوائے ہمہ دانی

کوئی کہتا ہے یہ باطل، کوئی کہتا ہے وہ باطل
غرض اس کشمکش میں نظم ہستی کی پریشانی

بہت بھٹکے اندھیروں میں یہ نکتہ تب ہوا روشن
یہ موتی ہاتھ تب آیا بہت سی خاک جب چھانی

جہانِ رنگ و بو صد برگ نیرنگِ شگفتن ہا
نشاطِ ذوقِ پیدائی چمن ایجاد حیرانی

سکون سرمدی ہے تہ میں جو دریائے بے حد کی
وہی موجوں کی صورت سطح پہ ہے گرم جولانی

تفکر نفس و آفاق میں عنوانِ عرفاں ہے
کہ یہ آیاتِ ربانی کہ وہ آیاتِ ربانی

مطبوعات جدیدہ

سیرت سلطان ٹیپو شہید از جناب مولانا محمد الیاس ندوی متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور طباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۶۰۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس ۱۹، لکھنؤ، یوپی۔

ہند بلکہ عالم اسلام کے دور زوال میں جن اولوالعزم حکمرانوں نے شجاعت، غیرت وحمیت اور عدل و انصاف کی داستانوں کو اپنے پاکیزہ لہو سے تابناک اور سرخرو کیا، ان میں ابوالفتح ٹیپو سلطان کا نام سر فہرست ہے۔ ان کی شکل میں سرنگا پٹن کی سرزمین نے تاریخ کے دامن کو بیش قیمت ہیرے سے مالا مال کیا، حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد صفت ٹیپو شہید اپنی زندگی ہی میں اساطیری کردار کے حامل ہو گئے، انگریزوں کے ڈیڑھ سو سالہ دور اقتدار میں گو سلطان شہید کے سوانح بالکل پردۂ خفا میں نہیں رہے، انگریزی اور اردو میں چند عمدہ کتابیں شائع بھی ہوئیں لیکن ان کی مفصل تاریخ اور ایک ایسے تذکرہ کی کمی رہی جس میں اللہ کے اس شیر کی تصویر بے کم و کاست نظر آتی، زیر نظر کتاب اسی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی اور بے شبہہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے، لائق اور نوجوان مصنف کو سلطان شہید سے نسبت ہم وطنی کا شرف بھی حاصل ہے وہ اشراف عرب کی قدیم ہندوستانی ساحلی بستی بھٹکل کے خاندان نوائط کے فرزند ہیں، اردو ان کی مادری زبان نہیں لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حصول تعلیم

کے بعد انہوں نے شستہ اور رواں اردو میں تحریر کا ملکہ بھی پیدا کیا اور یہ کتاب اس کا نمونہ ہے، پچیس ابواب کی اس کتاب میں ٹیپو سلطان، ان کے والد حیدر علی اور میسور زمین کی تاریخی حیثیت سلطنت خداداد اور اس زمانہ کے سیاسی، فوجی اور تمدنی احوال کو بڑی محنت سے بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ تین سو سال پہلے کے ہندوستان اور عالم اسلام کی سیاسی و اخلاقی صورت کو بھی جامعیت سے پیش کیا گیا ہے، ٹیپو سلطان کی سیرت میں خاص طور پر ان کی رواداری اور اسلام سے ان کے عشق کا بیان بڑا دلکش اور موثر ہے، مراجع اور مآخذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع پر حتی الامکان وسیع مطالعہ کیا گیا ہے تاہم چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر ہے جو تاریخی و تحقیقی استناد کے معیار سے فروتر ہیں، مباحث میں طرز معروف کے مطابق حوالوں کی عدم موجودگی کا بھی احساس ہوتا ہے، حیدر علی کے برسر اقتدار آنے کے محرکات میں دو ابتدائی اسباب محل غور ہیں، اس شکل میں تو ہر استعماری کوشش کے لیے وجہ جواز فراہم ہو سکتی ہے، سلطان شہید کے حادثہ شہادت میں واقعہ نگاری سے زیادہ قصہ گوئی کا رنگ نمایاں ہے، کتاب حسن طباعت کا نمونہ اور جاذب نظر اور بامعنی سرورق سے آراستہ ہے، لیکن کمپیوٹر کی کتابت خاصی ناقص ہے جس سے املا کی صحت پر اثر پڑتا ہے، مثلاً دُہرا کو دھرا، گھر کو گہر، پورا کو پورہ اور ابرو کو آبرو لکھ دیا گیا ہے، ص ۲۲۷ پر انگلستان کے وزیر اعظم اور ہندوستانی گورنر جنرل کے نام بھی غلط لکھے گئے ہیں، لیکن ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ سلطان شہید کی بہترین سوانح ہے جس میں واقعہ نگاری، مورخانہ غیر جانب داری کے علاوہ جذبہ و احساس کی پاکیزگی اور غیرت و حمیت کی تپش بھی شامل ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور سلطان شہید کے معتبر سوانح نگار پروفیسر بی، شیخ علی کی مفید تحریروں سے کتاب کے وزن و وقار میں اور اضافہ ہوا ہے۔

ع۔ ص۔